جواہر اسرار اللہ

تنقیدی تدوین

مقالہ برائے پی ایچ ڈی:

شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ

۱۹۸۹ء — ۱۹۹۰ء

برای خدمت (محترم) و محضر حضرت سید رشید [illegible] العلوی

سجاده نشین بارگاه حضرت سید [illegible] گیلانی [illegible]

برادرت

(دکتر احمد [illegible] الجیلانی)

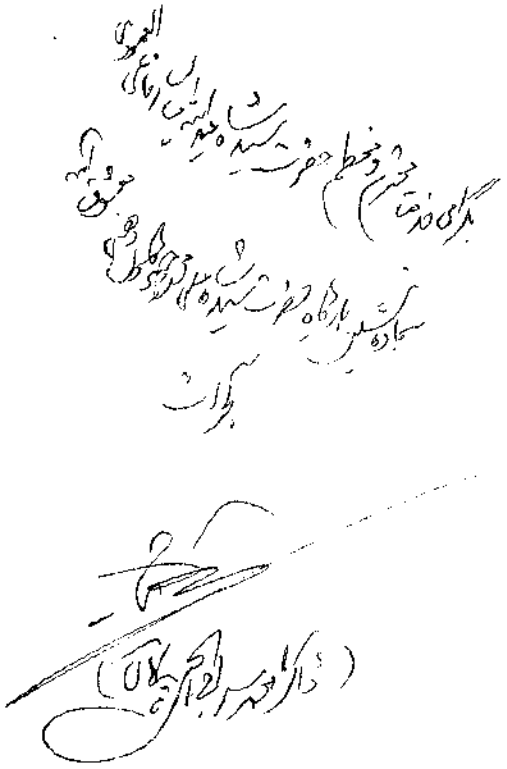

نذر

حضرت سید شاہ عبداللہ میاں عمودی الرفاعیؒ

سجادہ نشین درگاہ حضرت سید شاہ علی جی گام دھنی معشوق اللہ

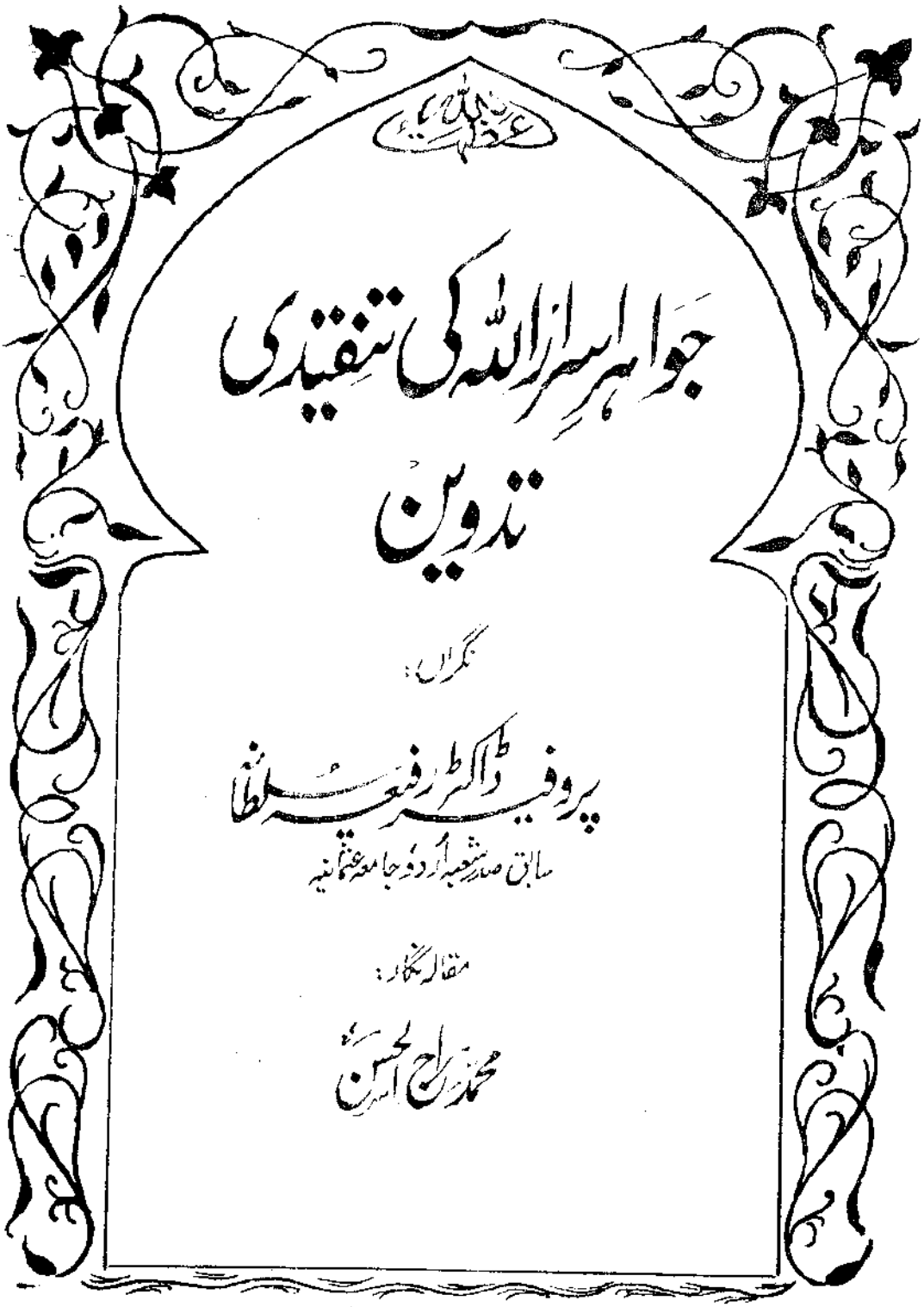

جواہرِ اسرار اللہ کی تنقیدی تدوین

نگراں:

پروفیسر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ

سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ

مقالہ نگار:

محمد سراج الحسن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

۱۔ پیش لفظ ... ... ایک بے بصارت کی بصیرت

۲۔ باب اوّل ... ... سیاسی، سماجی و تہذیبی پس منظر

۳۔ باب دوم ... ... حالاتِ مصنف علیہ الرحمہ و خاندانِ عالیہ

۴۔ باب سوم ... ... تصوّف

۵۔ باب چہارم ... ... جواہرِ اسرار اللہ

۶۔ کتابیات، شجرات، تصاویر و تعلیقات

تحتِ ابواب عنوانات

۱۔ ایک بے بصارت کی بصیرت ... ۳
۲۔ مقدمہ۔ سیاسی سماجی پس منظر ... ۸
۳۔ جواہر اسرار اللہ کے قلمی نسخے ... ۳۵
۴۔ زبان ... ۴۰
۵۔ جواہر اسرار اللہ کے نظموں کی ہیت ... ۴۳
۶۔ جواہر اسرار اللہ کی ایک صنف سی حرفی ... ۴۹
۷۔ حضرتؒ کی ایک اور تصنیف ... ۶۱
۸۔ حیات ... ۶۲
۹۔ نام و تخلص ... ۶۳
۱۰۔ خطابات ... ۶۵
۱۱۔ نسب ... ۶۹
۱۲۔ خاندانِ عالیہ ... ۷۲
۱۳۔ بچپن ... ۸۲
۱۴۔ خصائص و اوصافِ حمیدہ ... ۸۴
۱۵۔ ازدواج ... ۸۶
۱۶۔ خلفاء و جانشین ... ۸۷
۱۷۔ وصال و مزار ... ۹۲
۱۸۔ تصوف ... ۱۰۳
۱۹۔ تصورِ وحدۃ الوجود۔ تمہید ... ۱۱۵
۲۰۔ جواہر اسرار اللہ کا تصورِ وحدۃ الوجود ... ۱۱۶
۲۱۔ تصورِ حسن و عشق ... ۱۲۸
۲۲۔ تصورِ خیر و شر ... ۱۳۴
۲۳۔ نظریۂ تصور و تصدیق ... ۱۳۷
۲۴۔ جواہر اسرار اللہ ... ۱۳۸
۲۵۔ شجرۂ نسب ... ۳۱۷
۲۶۔ سلسلۂ بیعت ۱ ... ۳۱۹
۲۷۔ سلسلۂ بیعت ۲ ... ۳۲۱
۲۸۔ سلسلۂ سجادگان ... ۳۲۳
۲۹۔ سلسلۂ عمودیہ ... ۳۲۴
۳۰۔ کتابیات و تبرکات و تصاویر ... ۳۲۵ / ۳۳۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم وسلام علی الحنیفۃ

ایک بے بصارت کی بصیرت

صوفیائے کرام نے اپنے سرچشمہ فیض سے تاریخ ادب اردو کے خزانۂ علمیہ میں ایسے بیش بہا جواہر آب دار موتی بھر دیے کہ جس کی خیرہ کردینے والی چکا چوند سے آج بھی ایوانِ لسانیات جگمگا رہا ہے اور قصرِ ادب العالیہ میں تاحال اس کی آب و تاب ماند نہیں پڑی۔ صدیاں بیت گئیں، شب و روز گزرتے رہے، زمانے بدلتے گئے، حالات کی اونچ نیچ نے تہ بہ تہ گرد کے انبار چھپا دیے لیکن ان برگزیدۂ عالم ہستیوں کے کارناموں کی عظمت آفریں صورت پر دھندلائی نہ جا سکی۔

خانوادۂ رفاعیہ کے بزرگوں اور ان کے تصوّف کی حق نما تحریروں سے اک عالَم اُن نورانی نفوس کا عرصہ دراز تک گرویدہ اور اُن کے آستانۂ فیض سے برسوں چمٹا رہا۔ ان عظیم المناقب اصحاب نے بھی اس سلسلے میں اپنی امتیازی شان اور باوقار ہمہ جہتی خدماتِ قدسیہ سے حیاتِ انسانی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا۔ ویرانوں کو سبزی و شادابی بخشی تو سنسان راہوں کو رونق و روشنی دی۔ جہاں جہاں تک ان کے نقشِ قدم کی بات گئی، عزّ و شرف کے

باعث ان راستوں کی خاک کے ذرہ تاروں سے نظر ملانے لگے۔

گجرات میں روزِاول ہی سے چشتیہ و سہروردیہ بزرگوں نے اپنی علمی خدمات و فیض رسانی سے عوام کے قلوب کو منور اور اُن کی روحوں کو پاکیزگی عطا کی تھی، ان میں علاوہ حضرت سیدی شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کے شیخ بہاءُ الدین باجن (۷۹۰ھ م ۱۳۸۸ء / ۹۱۲ھ م ۱۵۰۶ء)، قاضی محمود دریائی (۸۷۴ھ م ۱۴۶۹ء / ۹۴۱ھ م ۱۵۳۴ء) قابلِ ذکر ہیں۔ جنھوں نے اپنے فیضانِ علمیہ سے سرزمینِ گجرات کو وہ رونقِ دوام بخشی کہ طائفہ شعراے دکن کو اکتسابِ فیض کرتے ہی بنی وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اہلِ علم کی اکثریت نے حلقہ بگوشی قبول کی تو بیشتر صاحبانِ انشاء نے اپنا قلم ان کے قدموں میں ڈال دیا اور کئی ایک نے تو اپنے علمی سفر پر کمر بستہ ہونے سے قبل انہی کی تحریروں کو اپنی راہ کا قطب نما بنا کر اپنے نوزائیدہ قلم کے نوک پلک درست کر لیے۔

حضرت سیدی سلطان العارفین شاہ علی محمد جیو گاؤں دھنی معشوق اللہ قدس سرہٗ کا مقام و مرتبہ ان سب میں اس لحاظ سے بلند و بالا نظر آتا ہے کہ آپ نے درس و تدریس کا منظوم و مہتم بالشان دینی و اخلاقی نصاب مرتب و مدوّن کیا تھا اور خود ہی اپنے اس مدوّنہ نصاب کے معلمِ اول بھی تھے۔ آپ خانوادۂ عالیہ رفاعیہ کے چشم و چراغ اور اپنے جد سلطان سیدی شاہ عبدالرحیم رفاعی محبوب اللہؒ (م ۸۷۹ھ) کی دعاے مقبول تھے۔[1] آپ کے کمالات و تصرفاتِ باطنی حدِ شمار سے باہر ہیں۔ آپ کے اوصافِ عالیہ و اخلاقِ حمیدہ اپنے جدِ اعلیٰ سیدی سلطان الواصلین محی الحق شرع و دین سلطان سید احمد کبیر رفاعی رضی اللہ عنہ سے مشابہ اور صد فیصد ملتے جلتے تھے۔ کیا تفقہ دینی اور کیا تبحرِ علمی، آپ اپنے زمانے کے تمام علما و شیوخ میں ممتاز تھے۔

حضرت سیدی شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کا تصوف، دبستانِ شیخ اکبر، محی الدین ابنِ عربیؓ کا نمائندہ ہے، فلسفہ الٰہیات میں شیخ اکبرؒ کی ترجمانی کا جو حق شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے ایک نوزائیدہ ہندوستانی زبان میں ادا کیا ہے مثال نہیں ملتی۔ آپ نے علم و عرفانِ الٰہی کے اس ٹمٹماتے چراغ کو آندھیوں میں بھی جلائے رکھا اور اس سے توحید

کے کئی بجھتے چراغوں کو روشنی عطا فرمائی۔ اس کے انوار و برکات سے تیرہ و تار عالم میں دور دور تک اُجالا پھیلا۔

دنیائے علم و ادب ہو کہ عالمِ خلق و سبب، آپ کی قد آور شخصیت میں پورا زمانہ سمٹا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ اپنی ذات سے اک تحریک اور ایک مکمل مجلسِ علمی تھے، جس نے دل بھی گرمائے اور ٹوٹے دلوں کو جوڑنے کا کام بھی کیا۔ روح کو تڑپایا اور اس کی راحت کا سامان بھی فراہم کر دیا۔ آپ کا عظیم و ناقابلِ فراموش خصوصی شرف جو رفاعی نعمتوں اور مصطفائی رحمتوں سے مزین، اپنوں اور غیروں پر یکساں سایہ فگن تھا، مجھے بھی اپنے دامنِ فیض میں سمیٹ کر اپنے در کی جبہ سائی کا موقع عنایت فرمایا اور میرے خراجِ نیائش و عقیدت پر مسرت و خوشنودی کا اظہار کر کے مجھے اس کام کے لیے منتخب اور میرے اشہبِ قلم کو تازیانہ لگا کر اسے غیرت دلائی کہ اب تک یہ خشک و خاموش کیوں پڑا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ حضرتؒ کا آستانہ کبھی نہ سوکھنے والا وہ دریائے فیض ہے جس کے سیلِ رواں میں غوطہ لگا کر اصفیائے زمانہ نے آبدار موتی نکال لیے۔ اس کے بہاؤ میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی۔ یہ اُسی طرح بہ رہا ہے جس طرح روزِ اول اُسے بہتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

میری حیثیت ہی کیا اور میں اسے اپنا کام کیسے کہوں کہ "جواہر الاسرار اللہ" کے ایک صفحہ اور صفحے کی کسی ایک سطر کو بھی اپنی آلودہ و بے بصر آنکھوں سے دیکھ لینا سوءِ ادب سے کم نہیں چہ جائے کہ میں اس پر ناقدانہ نظر ڈال کر قیاس کی جادوگری جگاتا۔ میں اسے صاحبِ جواہر الاسرار اللہ کا روحانی تصرف سمجھتا ہوں کہ مجھ سے بے بضاعت و کم سواد کے حصے میں دیوان کی ترتیب و تدوین کا قرعۂ فال نکل آیا اور سچ تو یہ ہے کہ زمانہ، عرصۂ دراز تک جس بارِ گراں کا متحمل نہ ہو سکا تھا ــــــــ اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا ــــــــ یہ جو کچھ ہے اور جیسا کچھ پیشِ نظر ہے وہ سب انہی صاحبِ دیوان علیہ الرحمۃ کا فیضانِ نظر اور انہی کی زبانِ قلم کا تراوید ہے کہ اس کی ترتیب کے دوران اسے میرے ہاتھ میں تھما دیا، یہ ایک حقیقت ہے اسے عقیدتمندانہ تخیل کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

جواہر الاسرار اللہ کے کئی قلمی نسخے ملک و بیرونِ ملک کئی کتب خانوں میں الماریوں کی زینت بنے چار سو سال

سے بند پڑے ہیں۔ انھیں ایک نظر دیکھ لینے اور اس کے کسی ایک ورق و سطر کو اپنی آنکھوں کی جنت بنا لینے کی سعادت بھی کسی نے حاصل نہیں کی۔ یہ استعداد اور ہمت بھی انہی کی عطا کردہ ہے اور انہی کی چشمِ کرم کا فیض ہے کہ خشیت و پاسِ ادب سے میرے دھڑکتے ہوئے دل کو حوصلہ ملا ورنہ اسے ع

باوضو ہو کے بھی چھوتے ہوئے ڈر لگتا تھا

اس موقع پر محترم و معظم سیدی کمال الدین رفاعی، سجادہ نشین خانقاہِ عالیہ بروڈہ گجرات کی کرم فرمائی کو میں کیسے فراموش کر سکتا ہوں کہ انھوں نے مجھ سے غیر متعارف شخص کے ساتھ پہلی ہی ملاقات میں خلوص و محبت کا ایسا اظہار کیا جیسے کوئی برسوں اپنے بچھڑے عزیز سے مل کر کرتا ہے۔ اپنا مہمان رکھا، میرے کام کو سراہا، دیوان کا وہ نسخہ جسے میں نے کتب خانۂ سالار جنگ حیدرآباد سے نقل کر کے رکھ لیا تھا انھیں دکھایا تو نہ صرف مسرت کا اظہار کیا بلکہ فرطِ عقیدت میں اسے اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ دوسرے دن مجھے اپنے خانوادۂ عالیہ کی خاص بیاض "شجرۃ الاحمدیہ" کی زیارت سے مشرف فرما کر میرے اشتیاق کو بنظرِ استحسان ملاحظہ فرمایا۔ یہ بیاض خاصی بڑی نہایت خوش خط مطلا اور بیش بہا معلومات آفریں ثابت ہوئی۔ میں دیر تک شجرِ طاہر کی ایک ایک شاخ کو عقیدت مندانہ دیکھتا رہا جس کے پتے پتے سے تقدس کی شان جھلکتی نظر آئی۔ ہر ہر صفحہ پر نظر اٹھتی اور میرا استعجاب بڑھتا جاتا کہ ہر ہر شاخ کی نورانی چکا چوند سے آنکھیں تر ہوتی جاتی تھیں۔ حضرت نے میری کیفیت، میرے ذوقِ فراواں کو مسکرا کر دیکھا اور شفقت بھرے لہجے میں یہ کہہ کر "میں اس کی فوٹو کاپی آپ کو پیش کر دوں گا" اپنے آدمی کو اشارہ فرمایا اور اس "شجرۃ الاحمدیہ" کی نہایت عمدہ فوٹو کاپی جسے پہلے ہی سے حضرت نے اس کے تحفظ کے خیال سے اپنی نگرانی میں تیار کروا کر رکھ لیا تھا، میرا نام اپنے دستِ مبارک سے اس کی لوح پر لکھ کر مجھے عنایت فرمایا۔ پھر ایک تعارفی خط گجراتی زبان میں حضرت عبداللہ میاں عمودی الرفاعی سجادہ نشین درگاہ حضرت سیدہ شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کے نام تحریر کر کے میرے سپرد کیا۔ میں حضرت،

کے اس کرم بے پایاں کی شکرگزاری سے تاحیات عہدہ برآ نہیں ہو سکتا آپ کی وسعتِ نظر و سیر چشمی سے خاندانِ عالیہ رفاعیہ کے بزرگوں کی صفات کا مرقع آنکھوں میں آئینہ ہوگیا۔

مواد کی فراہمی میں حضرت سید عبداللہ میاں عمودی والرفاعی سجادہ درگاہ حضرت شاہ علی جیو گام دھنی ؒ نے میری ہر طرح اعانت فرمائی۔ وہ تمام تبرکات، شجرہ جات، نوادراتِ رفاعیہ جسے احتیاط و حفاظت کے پیشِ نظر پوشیدہ رکھا جاتا ہے بتایا نہیں جاتا میرے سامنے تمام و کمال رکھ دیئے اور استفادہ کرنے کی پوری اجازت دے دی بعض قدیم فرامینِ شاہانِ گجرات و دہلی کے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان میں سے بعض کی میں نے نقل رکھ لی اور بعض کی تصاویر لے لیں، میں ان کا شکرگزار ہوں۔

اِس مقالے کی بہتر صورت گری میں پروفیسر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صاحبہ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میری جو رہنمائی کی ہے، اک خصوصی کرم ہے جو بیشتر تلامذۂ خاص ہی کو حاصل ہوتا ہے اس کی حیثیت عام نہیں۔ اس موقع پر میں اپنے دوست جناب عبدالعزیز جی معرفتیہ کو کیسے بھول سکتا ہوں جنھوں نے مجھے تحقیق کے دوران بعض اہم معلومات کی فراہمی میں تعاون کیا میں ان کا مشکور ہوں۔

بسم سبحانہٗ تعالیٰ

مقدّمہ

سیاسی و سماجی پس منظر

تاریخِ ادبِ اُردو میں گجرات کے صوفیا کی ادبی و علمی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو، جو اپنی ابتدا ہی سے مختلف اصناف اور متنوع علاقائی تہذیبوں کی روح سے روشناس ہو کر عوام کے ذہن و دل و دماغ سے قریب تر ہو چکی تھی، صوفیا نے اسے اظہارِ خیال کا تحریری معیار عطا کر کے اسے اس قابل بنایا کہ عوام کا ہر طبقہ اس میں اپنی تسکین و راحت کا سامان پانے لگا۔ یہ خاصانِ خدا ہی کا کام تھا کہ انھوں نے اُردو کے مزاج کو روحانیت کے تقدس اور اُلوہیت کے افکارِ عالیہ کی پاکیزگی سے سجا سنوار کر اس کے دامن کو اس قدر جاذبِ نظر و کشادہ کر دیا کہ اسمیں ہر شئے کا حسن سمٹ کر آ گیا۔ گجرات کی سرزمین کو بلاشبہ یہ فخر حاصل ہے کہ اُردو زبان کے ابتدائی دور میں اِسے گود دوں کھلایا اور پاؤں پاؤں چلنے کے زمانے میں اِسے انگلی کا سہارا دے کر پروان چڑھنے میں ماں کی محبت اور ممتا کے چاؤ کا حق ادا کیا۔ یہاں کے زندہ ماحول میں پل بڑھ کر صالح معاشرتی اقدار، ہمہ گیر جمالیاتی اسلوب اور حکیمانہ لب و لہجہ کی بدولت جلد عوامی مقبولیت

اور سلطانی جمہوریہ کا تاج سر پر پہنے اپنی جلالت وسطوت کا پرچم امتیاز ہاتھ میں لیے، تخلیق وتخیل، تہذیب وتمدن کی پاکیزہ وحسین دنیا تعمیر کرنے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

صوفیائے کرام نے اس ریاست کو اپنی دعاؤں اور توحید والوہیت کے سرمدی نغموں سے بھر دیا تھا۔ یہاں کی فضائیں جن ان تصورات سے مہک گئیں، اسے ہمیشہ کے لیے رحمتِ الٰہی کا مستحق بنا دیا۔ یہاں کی رواداری، پیار ومحبت، صلح وآشتی اور خدمتِ خلق کے دل موہ لینے والے گیت اور صوفی شعراء کے کلام نے عوام کے ہر گروہ کو اپنا گرویدہ بنائے رکھا۔ یہاں کے کشادہ قلب حکمراں، ہمیشہ اللہ والوں کی خوشنودی اور ان کی رضا کے طالب رہا کرتے۔ کبھی ان کی دل آزاری ودل شکنی کے کسی واقعہ کو کسی بھی جہت سے وقوع پذیر ہونے نہیں دیتے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ اہلِ علم وفن وصاحبِ امن وایمان حضرات کی اک بڑی تعداد اقصائے ملک سے کھنچ کھنچ کر گجرات کی طرف ہجرت کر آئی کہ تشنگانِ علم وادب کی پیاس بجھائے۔ یہ بھی انہی عالی قدر حکمرانوں کی علمی وادبی سرپرستی ہی کا نتیجہ تھا کہ[1] گجرات عرصہ دراز تک تہذیب وتمدن کا گہوارہ، علم وادب کا مرکز، فکر وفن کا قبلہ نما رہا۔ اہلِ حق، گجرات کو اسلامی ہند کا کوفہ جانتے تھے اور اہلِ علم اسے اشبیلیہ کا مثل قرار دیتے۔ چینی وعرب سیاح جب بھی یہاں سے ہو کر گزرے یہاں کی علمیت ومرفہ الحالی کے ذکر سے اپنی زبان کو تر رکھا۔ زمانۂ قدیم سے اس ریاست کو تاریخ میں "سوتی منڈل"[2] کے نام سے جانا جاتا تھا۔ مراۃ احمدی کا مصنف لکھتا ہے:

"گجرات کہ زیب وزینتِ ہندوستان است۔ اہلِ کسب

وارباب ہنر ہمہ جہت می باشند"[3]

تاریخ کے پس منظر میں آیئے گجرات کے حالات کا جائزہ لیں:

بابر کے انتقال اور ہمایوں کی تخت نشینی (سنہ ۹۳۷ھ م سنہ ۱۵۳۰ء) کے بعد ملک کے حالات اک نئی دنیا اور نئے دور کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ ایک طرف سیاسی وسماجی تبدیلیوں کے باعث ایک "مخلوط طرز فکر" نے مقبولیت

حاصل کر رہا تھی جسے صوفیائے کرام نے نیک مقصد کے لیے استعمال کیا جس نے آگے چل کر یگانگت و رواداری کی سرزمین میں چار چاند لگا دیے، دوسری طرف افغانوں اور بلوچیوں کی شورشوں نے عوام کو چین کی نیند سونے نہیں دیا۔ ہمایوں کو اتنا وقت بھی نہ ملا تھا کہ وہ اپنی سلطنت کو مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم کر کے اسے اپنے جانشینوں کے لیے بہتر حالت میں چھوڑ جاتا۔ تخت نشین ہوتے ہی ہمایوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اندرونی حالات سے نمٹ کر اپنی سلطنت کو مضبوط و قوی بنانا تھا۔ اُسے بیرونی خطرات سے کہیں زیادہ اندرونی خلفشار و مشکلات پر قابو پانے کی فکر تھی۔ اس نے اپنے بھائیوں کو حکومت کے بعض اہم علاقے دے کر جس غلطی کا ارتکاب کیا تھا اس پر وہ بیٹھے ہی آپ سوچ کر دل مسوس کر رہ جاتا۔ سب سے زیادہ اسی خیال نے اسے پریشان و پراگندہ بنا رکھا تھا۔ ایک طرف افغان اس کی ماتحتی و بالادستی قبول کرنے پر کسی طرح راضی نہ تھے، دوسری طرف اس کے عزیز ان منقسمہ علاقوں کے حصول و قبضہ کے بعد اس کے درپے آزار ہو گئے تھے۔ یوں بھی ہمایوں کو اپنے باپ سے ورثے میں جو حکومت ہاتھ لگی تھی وہ سیاسی نظریات کی بنیاد پر قائم ایک جدید سیکولر شاہی تھی جس میں مذہب اور اس کے اختیارات کا دائرہ، اس کے اصول ثانوی درجہ رکھتے تھے جب کہ افغان فطرتاً مذہب سے جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ دین و دنیا کے ہر معاملے کو مذہب ہی کے بتائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں پرکھنا اور دیکھنا پسند کرتے تھے۔ یہی بات ہمایوں کے لیے سب سے زیادہ دردِ سری ہوئی تھی جو بابر نے بھی راجپوتوں سے مصاہرت و ازدواجی تعلقات قائم کر کے بین قومی رواداری، سیاسی مصلحت کوشی و دور اندیشی کا ثبوت فراہم کر دیا تھا اور اپنے دربار کو ہر قسم کے طبقاتی تناؤ و مذہبی کشاکش سے پاک و صاف رکھا تھا جسے اپنا کر ہمایوں نے بھی اپنی وسیع المشربی و رواداری حکمت عملی کا بھرم قائم رکھا تھا۔ افغانوں کو ایک تو شکرہ بھائی اور ضدوں نے اس کے خلاف ایک نیا محاذ کھولا اور اسے کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ یہاں ان کے اس جذبۂ نسلی امتیاز سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جو ان کی گھٹی میں پڑا تھا اور جس نے افغان ـــ دوری کی حد سے تجاوز کر گیا تھا

جس نے انھیں مرزا محمد خاں کی سرکردگی میں ہمایوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے وقت اُن تمام افغانوں کو متحد کیا تھا جو کبھی منتشر و خانہ بدوش تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمایوں کی ٹڈی دل فوج کے مقابل ان کی ایک نہ چل سکی اور ایک فیصلہ کن موڑ پر ہمایوں شاید ان سے مصالحت کر لیتا لیکن تقدیر نے افغانوں کو سر کے بل گرا دیا اور وہ بے بس و مجبور ہو کر بے آبرو ہو گئے اور انھیں اپنے منتشر ہو جانے ہی میں عافیت نظر آئی۔ انہی افغانوں میں سے کچھ افغان سردار گجرات سے اپنے دیرینہ و قدیم سیاسی تعلقات کی بنا پر وہاں کے حکمران بہادر شاہ کے خواست گار ہوئے اور وہاں جا کر پناہ لی۔ کچھ افغان سرداروں کو اس فکر میں صحرا و بیاباں کی خاک چھاننی پڑی کہ ہمایوں سے اس شکست و ریخت کے قرض کا بوجھ کس تدبیر سے اتارا جائے جو انھیں جونپور کے محاذِ جنگ کے میدان میں اسے لینا پڑا۔ ادھر ہمایوں کو بھی اس کامیابی سے اطمینان نہ ہوا اگرچہ وہ اس مہم میں سرخرو ہو چکا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ یقینی طور پر یہ چاہتا تھا کہ سارا ہندوستان اس کے زیرِ نگیں آ جائے اور اس کی حکومت کا سکہ بنگال سے بدخشاں تک چلنے لگے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے تاریخ کی ایک مدبرانہ مصلحت پھر اس سیاسی حربے سے کام لیا جو اس کے دائرۂ اختیار میں تھا۔ اس نے بعض افغان سرداروں کو اپنی دور اندیشی اور سیاسی حکمتِ عملی سے کام لے کر اپنا ہم خیال بنا لیا اور کچھ سرداروں کو اپنی سیاسی مصلحت اندیشی سے اپنی سازش کے جال میں پھانس لیا۔ پھر کیا تھا ہر طرف دنیا اس کے قدم چومنے لگی۔ اس نے شمالی ہند کے بعض علاقے بلا کسی مزاحمت کے اپنی عمل داری میں شامل کر لیے۔ اس کام سے فارغ ہو تو ۱۵۳۵ء میں گجرات پر فوج کشی کرنے کے لیے نکل پڑا۔ اگرچہ اس مہم میں اسے بڑی بھاری قیمت چکانی پڑی لیکن اس مرحلے میں بہر حال اسے اپنی ہمت کا دامن بڑی مضبوطی سے تھامے رکھنا پڑا اور اس کے لیے اسے اپنی قسمت سے بھی مدد لینی پڑی۔ جسے "ہمایوں بختی" ہی سمجھنا چاہیے۔ ادھر فرید خاں، جو کبھی ہمایوں کا مقابل تھا اور افغانوں کی حمایت میں ہمایوں کے ساتھ کسی قسم

ہوا تھا جو یونانی سپہ سالار بصیرت ... دیا اور اپنی غیرت قوم کی سپر اس کے سامنے ڈال دی ۔ رومی خاں کے مل جانے کے بعد ہمایوں کو گجرات کا فتح کرنا کچھ زیادہ مشکل نہ رہا وہ ایک لشکر جرار لے کر گجرات پر حملہ آور ہوا اور پلک جھپکنے کی دیر میں فتح یابی کے شادیانے بجاتا ہوا گجرات میں داخل ہوا اور جشن فتح منانے کا اعلان کیا اس جشن میں عام عوام کو بھی شرکت کی اجازت تھی ۔

جشن فتح کا دن ہے ، دربار لگا ہے عوام اپنے نئے حکمراں کی ایک جھلک دیکھنے کی تمنا میں ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑ رہے تھے خوشی اور مسرت کے اس موقع پر کسی نے گجرات کے شکست خوردہ حکمراں بہادر شاہ کا ایک بولتا ہوا طوطا ہمایوں کی نذر کیا ۔ لوگ دربار کی شان دیکھنے میں خود فراموشی کا شکار ہو کر بت بنے کھڑے تھے ، عوام و عمائدین شہر سے دربار کھچا کھچ تھا ۔ باری باری افسران فوج ، متوسلین بابِ حکومت بادشاہ کے سامنے آتے اور خراج نیاز پیش کر کے اپنے مقام پر بیٹھ جاتے ۔ اپنی باری پر رومی خاں بھی دربار میں آیا اور بادشاہ کے سامنے جھک کر سلامی پیش کرنا ہی چاہتا تھا کہ طوطا چیخ اٹھا :

" پھٹ رومی خاں نمک حرام ! (پھٹ رومی خاں حرام خور ") علی محمد، تاریخ ادب[؟]

حامد حسن قادری نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے ۔

" اردو کے رواج اور بول چال کا ایک عجیب و دلچسپ ثبوت یہ واقعہ ہے کہ ۱۵۳۵ء میں ہمایوں بادشاہ نے بادشاہِ مالوہ و گجرات بہادر شاہ پر حملہ کیا اس کا سپہ سالار رومی خاں مغلوں سے خفیہ طور پر مل گیا تھا ۔ رومی خاں کی غداری و بے وفائی سے بہادر شاہ کو شکست ہو گئی ، ہمایوں کو اسباب غارت میں بہادر شاہ کا ایک طوطا بھی ہاتھ آیا ، طوطا انسان کی طرح باتیں کرتا تھا ۔ فتح کے بعد ہمایوں کے دربار میں طوطے کا پنجرہ رکھا ہوا تھا ۔ رومی خاں دربار میں حاضر ہوا تو طوطا

اس کو دیکھتے ہی چلا اٹھا:

"چھٹ پاپی رذی خاں نمک حرام، چھٹ پاپی نمک حرام"[۵]

ہمایوں کی اس فتح نے اس کے جذبۂ ہوسِ ملک گیری کو تقویت پہنچائی۔ وہ روز و شب ایک وسیع تر حکومت کے خواب بُنتا رہتا۔ ادھر شیر شاہ سوری بھی اس فکر میں تارے گن رہا تھا کہ کس طرح افغانوں کی شکست خوردگی کا بدلہ لے۔ اس مقصد کے لیے وہ شبانہ روز فوج کی ترتیب و تنظیم میں لگا رہا اور جب اک قابل و منظم لشکر تیار ہو گیا تو آندھی اور طوفان بن کر ۹۴۷ھ م ۱۵۳۹ء میں ہمایوں کے سر پر پہنچ گیا۔ اس موقع پر افغانوں نے اپنی قومی یگانگت کا بہتر مظاہرہ کیا اور شیر شاہ کی سرکردگی میں ہمایوں کے فتح کردہ تمام علاقے اس سے چھین لیے اور شیر شاہ کی خودمختاری و بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ افغان سرداروں کی دیرینہ آرزو بار آور ہوئی۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے اور بنارس کے مقام پر جشنِ فتح کا یادگار دن منایا۔ اس موقع پر شیر شاہ نے بھی اپنا لقب "شیر شاہ سلطان عادل" اختیار کر کے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔

تاریخ ہمیشہ کھرا فیصلہ کرتی ہے وہ کسی کو معاف نہیں کرتی۔ ہمایوں کے ساتھ اس کا فیصلہ ایسا ہی تھا۔ کیوں کہ اس کی مملکت انتشار و خانہ جنگی کا میدان بن چکی تھی۔ اس کی فوج میں نسلی امتیازات، قبائلی عصبیت ذہنیت، وہ ناسور کی طرح گھر کر چکا تھا۔ خود غرض و موقع پرست افسروں نے حرص و طمع، لوٹ کھسوٹ اور مقصد براری کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ان میں نظم و نسق، فوجی عزائم اور سرفروشی کی سپاہیانہ روح معدوم ہو چکی تھی۔ برخلاف اس کے شیر شاہ نے اپنی فوج کو جذبۂ جاں نثاری سے سرشار کر رکھا تھا۔ ہمایوں کی ذلت آمیز شکست اور اس کی بری طرح ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی حکومت ناکافی نظام کے ساتھ ایک وسیع تر علاقے پر پھیلی ہوئی تھی جس کے

"مغربی علاقے، قندز، بدخشاں، کابل، غزنی اور قندھار تک پھیلے

ہوئے تھے، ہندوستان میں ملتان، پنجاب، اترپردیش اور بہار
کا کچھ علاقہ اس کی سلطنت میں شامل تھا۔ بیانہ، رنتھمبور، گوالیار،
الور، چندیری اس کی سلطنت اور راجپوتانہ و مالوہ اس کی
ریاستوں کے درمیان ایک غیر مستقل سرحد کی حیثیت رکھتے تھے۔[۱]

جس کا انتظام ہمایوں کو تنہا خود اپنی ذات سے کرنا تھا۔ کیوں کہ اسے اپنے ابتدائی دور میں اپنے بھائیوں سے جو یا ہی سبق ملا تھا وہ ابھی اس کے ذہن میں تازہ تھا۔ فوج کی بگڑی ہوئی حالت اور نامناسب تنظیم نے اس کے رہے سہے عزائم پر پانی پھیر دیا تھا۔ ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھ کر ہمایوں نے ابتداء میں شیر شاہ سے مصالحت کر لینے ہی کو وقت کا تقاضہ سمجھا اور اس سلسلے میں اس نے پہل بھی کیا تھا، لیکن شیر شاہ نے ہمایوں کی تجاویز کو صرف اس شرط پر قبول کرنا چاہا کہ دریائے سندھ کو مغل اور افغان سلطنت کے درمیان سرحد کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔ یہ شرط ہمایوں کے لیے ناقابل قبول، آن بان اور وقار کا مسئلہ بن گئی جسے مغلیہ افواج نے بھی رد کر دیا۔ بالآخر جنگ کی ہولناک صورت نے شیر شاہ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ ہمایوں شکست کھا کر در بدر کی ٹھوکریں کھاتا بے سر و سامان جنگلوں کی خاک چھانتا پھرتا رہا۔ جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو ایران سے پناہ کا طالب گار رہا۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

"ہمایوں نے ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سے شکست کھائی اور راجپوتانہ
و سندھ کے ریگستانوں میں پریشان پھرتا رہا۔ یہاں امرکوٹ کے
مقام پر اکبر پیدا ہوا۔ جب ہمایوں ہندوستان کی طرف سے بالکل مایوس
ہو گیا اور اس کے بھائیوں نے اس کی کوئی مدد نہ کی تو اس نے
ایران کا رخ کیا۔"[۲]

۱؎ مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال (آر۔ پی۔ ترپاٹھی) ص ۲۶

۲؎ رود کوثر ص ۳۲

دکن اور گجرات کی ریاستیں شروع ہی سے اپنی سیاسی شناخت اور اپنا ایک علاحدہ وجود ، سلطنتِ دہلی سے متواتر رہیں۔ ان کا ذہن کبھی بھی شمالی ہند کی حکومتوں سے کسی بھی طرح سے بندھا نہیں رہا۔ یہاں کی فضا جس میں تسکینِ قلب ، راحت اور اطمینان بھرا ہوا ہے۔ یہاں کی مٹی تہذیب کی پروردہ اور تقدس کی امین ہے۔ انہیں حضرت آدم کو تلاشِ حوا کا خیال آیا۔ یہاں آ کر صوفیائے کرام کو وجدان ، اہلِ حرفہ کو ذوق اور سپاہی کو شمشیر زنگی کا حوصلہ ملتا ہے۔ یہاں کے شاہوں کی قدرداں ذاتی نے ہر طبقے کے فرد کی ایسی پذیرائی کی کہ یہاں ہر فن کے افراد جوق در جوق چلے آئے اور یہیں رہیں کے ہو رہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی تھی کہ ہر ایک کو اس کے ظرف و ہمت کے مطابق اپنی تقدیر آزمانے کی یہاں پوری آزادی و اجازت حاصل تھی۔ شاہانِ گجرات و دکن سو فیصدی ملکی و مقامی تھے اس لیے انھوں نے دیسی روایات ، مقامی رسم و رواج ، تہذیب و ثقافت کی دل کھول کر سرپرستی کی اور اس میں فطرت پسند تولی اور انسانیت نواز اسلامی روح پھونک کر ایسے ایک نئی مشترکہ تہذیب کی علامت عطا کی ، جو عوام کے ہر طبقہ میں مقبول اور ان کے اظہارِ خیال کا وسیلہ بن کر دلوں پہ حکمرانی کرنے لگی۔ یہ علامت کبھی گجری تو کبھی ہندوی و دکنی ، کبھی ریختہ تو کبھی اردو کے نام سے جانی جاتی تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں :

> "دکن و گجرات میں شمال کے خلاف تہذیب سیاسی قلعہ بندی کی وجہ سے
> اردو زبان کو بہت جلد دربار سرکار کی سرپرستی اور اہمیت و حیثیت حاصل
> ہو گئی جو شمال میں صرف فارسی زبان کو حاصل تھی ۔۔۔۔ لیکن جیسے عوام
> تک پہنچنا ہوتا وہ اسی زبان کو ذریعۂ اظہار بناتا ہے۔" [۱]

شیر شاہ سوری سے جنگ ہارنے کے بعد ہمایوں ایران کے شاہ طہماسپ صفوی کے یہاں پناہ گزیں

[۱] تاریخِ ادبِ اردو جلد اول ص ۱۴۶

ہو گیا تھا۔ گرچہ یہاں اسے اپنی طویل دشت نوردی و خانماں بربادی کے بعد یگونہ سکون حاصل ہو چکا تھا لیکن شکست کا آسیب اس پر بری طرح مسلط اور ذلت کا غم اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جاتا تھا۔ وہ ایران میں رہ کر ہندوستان کے حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ جب اسے بتایا جاتا کہ اب ملک کے حالات وہ نہیں رہے جو کبھی شاہانِ مغلیہ کے دور میں تھے، "وہ آثار جو عہدِ ہمایونی کی یادیں تازہ کر جاتے انھیں ملیا میٹ کر دیا جا رہا ہے۔ وہ شہر جسے مغل حکمرانوں نے اپنے خوابوں کی تعبیر میں سجایا تھا کسی ویرانے کا وحشتناک منظر پیش کرتے ہیں۔" وہ جب یہ سب کچھ سن لیتا تو بلبلا اٹھتا اور کسی انجانی قوت کی مدد یا مستقبل کے کسی کرشمے کا انتظار کر کے دل مسوس کر رہ جاتا۔ ہمایوں کے طرفدار ابھی ہندوستان میں بہت سی ذی حیثیت شخصیتیں موجود تھیں، جہاں تہاں اور جس کسی پر ہمایوں سے محبت یا لگاؤ کی چھاپ نظر آتی اُسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا تھا۔ انہی میں ایک حضرت شاہ محمد غوث گوالیری رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ جب شیر شاہ کو معلوم ہوا کہ شاہ صاحبؒ ہمایوں کے بہی خواہوں میں ہیں تو باز پرس کے لیے طلب کیا اور سختی سے پیش آیا۔ شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

> "ہمایوں ان کا معتقد تھا لیکن اب شیر شاہ کا دور دورہ تھا وہ شیخ کے درپے ہوا۔ چنانچہ شیخ اہل و عیال، مریدوں اور ساز و سامان کے ساتھ گجرات ہجرت کر گئے۔" [۱]

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتا ہے:

> "بعد از فراتِ ہند چوں شیر شاہ در مقامِ آزارِ شیخ محمد شد سفرِ گجرات اختیار نمود۔" [۲]

سیاسی اتھل پتھل کے باعث گجرات و دکن میں حالات بڑی تیزی سے بدلتے جا رہے تھے۔

[۱] رودِ کوثر ص ۳۹
[۲] منتخب التواریخ مطبوعہ نولکشور ۱۲۸۲ء ص ۲۷۹

ذہنی و معاشرتی بے سکونی کا ہر فرد شکار تھا۔ اسی انقلابی عہد میں حضرت سید شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ عوام کے قلوب اور ان کی تسکین کا مرکز بنے گجرات کے وسیع تر خطے کے نگران و محافظ تھے۔ آپ کے حلقے میں جو بھی پہنچ جاتا وہ ہر طرح محفوظ و مامون ہو جاتا۔ آپ نے ذریعۂ اظہار کے لیے عوام ہی کی مقبول ترین زبان کو اپنایا اور اپنے پیام کو عام کرنے میں اس سے خوب مدد لی۔ ڈاکٹر سید محمد حسین لکھتے ہیں:

"شاہ علی جیو کا عہد وہ عہد ہے جب گجرات میں تہذیبی سطح پر
انقلاب انگیز تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ مقامی رنگ و بو میں
فارسی زبان و ادب کا رنگ شامل ہو رہا تھا۔"[1]

شیر شاہ سوری کے طرز عمل سے دل برداشتہ ہو کر حضرت شاہ محمد غوث گوالیری رحمۃ اللہ علیہ گجرات پہنچے تو ان کی آمد پر علمائے گجرات نے مسرت کا اظہار کیا۔ شاہ صاحب کے تسخیر سبعہ سیارگان مکشوفات عالم ارواح کے علم سے علمائے گجرات بخوبی واقف تھے تاہم چند ایک ظاہر بیں علما نے شاہ صاحب کے آزمانے کی خاطر کچھ حیلے بنا کیے اور

"آپ کی ولایت و کشف و کرامات آزمانے کے لیے ایک جنازہ
طیار کیا اور اس میں ایک زندہ شخص کو سلا کر جس راستے سے آپ
تشریف لاتے تھے اُسی راستے میں لے چلے جب آپ تشریف لائے
مشائخین نے وہیں آپ سے ملاقات کی اور جنازہ کی نماز پڑھانے
کے لیے مُصر ہوئے آپ نے فرمایا کہ میں مسافر ہوں۔ مشائخین نے
نہ مانا اور بہت بجد (بضد) ہوئے غرض باصرار مشائخین امامت
قبول کی اور فرمایا کہ زندے کی نماز پڑھوں یا مردے کی۔ مشائخین نے

[1] اردو میں صوفیانہ شاعری ص ۱۲۹

کہا: آپ یہ کیا فرماتے ہیں۔ زندہ کی بھی کہیں نماز ہوتی ہے۔

فوراً آپ نے اللہ اکبر کہا: اُدھر صاحبِ جنازہ کی روح پرواز کی۔[1]

شائخین نے آپ کے مقام و مرتبہ کو پہچانا اور معافی کے خواستگار ہوئے۔ چند حضرات علما نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ تصنیف و تالیف میں بھی درک رکھتے تھے کچھ دنوں بعد آپ نے ایک رسالہ بنام "معراجیہ" تصنیف کر ڈالا۔ کتاب علما کے سامنے پیش ہوئی جسے پڑھ کر سبھوں نے اس میں بیان کردہ بعض باتوں سے سخت اختلاف کیا اور آپ سے اس بارے میں استفسار کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ تصنیف میری حقیقتِ حالیہ کا بیان ہے کہ "مجھے معراج ہوئی"۔ علما نے جب یہ سنا تو برہم ہوئے اور توبہ کرنے پر اصرار کیا، شاہ صاحب برابر کہتے رہے اور اصرار کرتے رہے کہ "مجھے معراج ہوئی"۔

تذکروں میں ہے کہ "رسالہ معراجیہ" اور معراج کے واقعہ کا اظہار، حضرت سیدی شاہ علی محمد جیوگاؤں دھنی قدس سرہٗ سے ملاقات کا نتیجہ تھا۔ امام الدین گلشن آبادی کا بیان ہے:

"ایک روز محمد غوث گوالیریؒ نے بڑی [illegible] شائخین جمع آ [illegible]
کو دعوت دی کہ گجرات [illegible] پہنچا [illegible]
شائخین جمع ہوئے مگر شیخ علی جیوگاؤں دھنیؒ کو جب آپ کے خادم نے
دعوت دی تو شیخ علی جیو نے فرمایا: "گجرات ہے سورات ہے
اس کے کہنے سے دعوت [illegible]
سنایا محمد غوث [illegible] شاہ علی [illegible]
کے مکان کی سات سیڑھیاں تھیں جب پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا
پہلے آسمان پر پاؤں گیا۔ جب دوسری سیڑھی پر پاؤں رکھا دوسرے

[1] تاریخ الاولیا، امام الدین گلشن آبادی، جلد د

آسمان پر پاؤں رکھا۔ اسی طرح ساتویں سیڑھی پر جب محمد غوث رحؒ
نے پاؤں رکھا، ساتویں آسمان پر پاؤں رکھا۔ جب اندرون مکان
پہنچے عرشِ اعظم پر تھے۔ جب شاہ علی جیو سے ملاقات کی خدا سے ملاقات
کی۔ ایسا انھیں معلوم ہوا۔ غرض بعد اسرار و نکات کے وہاں سے
مکان پر آ پہنچے اور مشائخین کی مجلس سے کہا کہ آج مجھکو معراج ہوئی[۱]

لیکن گجرات کے عوام میں یہ واقعہ اس طرح مشہور ہے کہ حضرت شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ بلاوقات روز بجگانہ اپنے کھیتوں میں تشریف لے جاتے اور سارا وقت یادِ الٰہی میں گزارتے۔ ایک دن آپ معمول کے مطابق کھیت میں مچان پر رونق افروز تھے کہ مغربی سمت سے حضرت شاہ محمد غوث گوالیری رحؒ ہاتھ میں مشعل روشن کیے دن اُجالے یہ کہتے ہوئے "گجرات رات ہے میں اس کو دن کیا چاہتا ہوں" آپ کے روبرو پہنچے، حضرت شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ نے سنا تو فرمایا: "جو رات ہے سو رات ہے اس کے اس طرح کہنے سے دن نہیں ہوگا"۔ شاہ محمد غوث گوالیریؒ نے آپ کو ایسا کہتے سنا تو رک گئے اور آپ سے خواہش کی کہ نیچے تشریف لاکر تشفی فرمائیں۔ شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ نے فرمایا: "جسے جو چاہیے وہ خود اوپر آ کے اور لے لے"۔ شاہ محمد غوث گوالیریؒ نے کچھ لمحے توقف کیا اور مچان پر نظر ڈالی تو کیفیت ہی بدل گئی پھر بسم اللہ کہہ کر اپنا پاؤں مچان کی پہلی سیڑھی پر رکھا اور ہر مرتبہ ہر سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے خود کو آسمانوں پر چڑھتے ہوئے پایا۔ سات زینے سات آسمان کی مثل زیرِ قدم تھے جب شاہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ مچان کے بالکل اوپر پہنچے تو انھیں محسوس ہوا کہ وہ عرشِ اعظم پر ہیں اور حضرت سید شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ پر جونہی نظر پڑی انھیں محسوس ہوا کہ وہ خدا کے سامنے ہیں۔ یہ حضرت شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کی خصوصی توجہ کا نتیجہ تھا کہ حضرت

[۱] تاریخ الاولیا ص ۳۵۵

شاہ محمد غوث گوالیری رح کو سبعہ سموات و سبعہ سیارگان کی تسخیر کا علم تھا اور وہ اس علم و فضل کے باعث خود کو ممتاز و فرد فرید جانتے تھے اس لیے حضرت شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ نے انھیں ان کے مقام سے واقف کرا دیا کہ جتنا وہ جانتے ہیں" کسب ہے"، فضل نہیں اور انھیں اپنے اس تھوڑے سے علم پر اترانا نہیں چاہیئے۔ آپ نے اپنی توجہ باطنی سے شاہ محمد غوث رح کو شانِ الٰہی کا جلوہ دکھایا تھا یہ آپ کی ذاتِ قدسی صفت کا ایک اشارہ تھا اس سے معلوم ہوا کہ حضرت شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کی ذات کمالاتِ الٰہیہ کا مرجع و منبع تھی اور علم و فضل کا بحرِ ناپیدا کنار۔ مولوی عبدالحق نے تذکرۂ اولیائے دکن کے حوالے سے لکھا ہے:

"محمد غوث گوالیری رح، گوالیر سے گجرات آئے تو آپ سے ملے اور آپ کے کمال کو تسلیم کیا"۔ ۱

اس واقعہ کے بعد حضرت شاہ محمد غوث گوالیری رح جب مجلسِ علما میں تشریف لائے تو دعویٰ کیا کہ انھیں آج معراج ہوئی ہے" اور پھر ایک رسالہ "معراجیہ" قلمبند کر دیا جو اسی عالمِ وجد و کیف کی صدائے بازگشت تھا اس واقعہ کے بعد حضرت غوث گوالیری رح عرصہ دراز تک حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں رہ کر مزید اکتسابِ فیض فرمایا۔ شیخ محمد اکرام کا بیان ہے:

"قریباً اٹھارہ سال اس علاقے میں گزارے۔ کچھ وقت چانپانیر اور بھڑوچ اور باقی وقت احمد آباد میں صرف کیا"۔ ۲

ان اٹھارہ برسوں میں شاہ صاحب قدس سرہٗ کے مخالفین کا دائرہ علما و عوام سے نکل کر اربابِ حکومت کے ذمہ داروں تک پھیل گیا۔ باوجود آپ کی صوفیانہ کمالوں کی تائید و طرفداری کے سنہ ۹۶۳ھ م ۱۵۵۶ء میں ہمایوں کی وفات پر بعمر ۱۳ سال اکبر، ہمایوں کا جانشین ہوا تو (گجرات کے علاقے پر سلطان محمود گجراتی حکمراں تھا) اکبر کی کم سنی کے باعث بیرم خاں ملک کے سیاہ سفید کا مالک بن بیٹھا اس نے اکبر کے کان بھرے اور غلط بیانی و دروغ گوئی سے کام لے کر شیخ

۱۔ رسالہ اردو، علمی جلد ۲، صفحہ ۱۵۰

۲۔ رود کوثر، نمبر ۳۶

محمد غوث گوالیریؒ کی دل آزاری میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور جب اس طرح بھی اُسے چین نہ آیا تو ان کی گرفتاری کا حکم جاری کروایا۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

"عہدِ اکبری کا پہلا صدر شیخ گدائی، شیخ کے خلاف تھا۔ جب وہ آگرہ پہنچے تو اس نے بیرم خاں کے کان بھرے کہ رسالۂ معراجیہ میں شیخ نے اپنی معراج کا دعویٰ کیا ہے اور اپنے آپ کو بڑے پیغمبروں سے فضیلت دی ہے۔ اُن سے پوچھنا چاہیے کہ یہ کہاں تک جائز ہے۔" ؎

حضرت سیدی شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کے علوے مرتبت و اعلیٰ مقام پر فائز ہونے کا ایک ثبوت ذیل کے اس واقعہ سے مل جاتا ہے کہ ایک دن مظفر شاہ گجراتی نے چند علمائے گجرات سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعۂ معراج کے جسمانی ہونے کی دلیل طلب کی۔ علماء جواب دیتے بھی تو کیا جواب دیتے سکوت اختیار کیا۔ کسی نے دلی زبان سے حضرت شاہ علی جیو گاؤں دھنی رح کا ذکر کر کے تمام علما کو مواخذہ سے بچالیا۔ مظفر شاہ خود حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ اس وقت کلام اللہ کی کسی آیت شریف کی کتابت فرما رہے تھے۔ جس وقت مظفر شاہ آپ کے سامنے پہنچا اور اپنا شبہ اور آنے کا عندیہ ظاہر کیا تو حضرت اس وقت آیت شریف کے کسی نقطہ کو درست فرما رہے تھے جس پر مظفر شاہ کی نظر بھی پڑ گئی اور جیسے ہی اس نے پلک جھپکائی خود کو کسی اور ہی دنیا کی سرحد پر کھڑا ہوا پایا جہاں کے لوگ اسی کی آمد کے منتظر نظر آئے اور کشاں کشاں اسے لے کر اپنے بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ بادشاہ نے اسی وقت اس کے حق میں اپنی سلطنت کے تمام ... کر دیے اور اپنی اکلوتی لڑکی سے بیاہ کا اعلان کر دیا۔ مظفر شاہ عرصۂ تک وہاں رہا ہوا

؎ رود کوثر ص ۵۰

زندگی بسر کرکے ایک دن بازار میں سیر کرتا ہوا اک ایسے مکان پہ پہنچا جہاں پر خطاط کو ایک نقطہ بناتے ہوئے دیکھ کر اس پر کیفیت طاری ہوگئی اور جب اسے ہوش آیا تو خود کو حضرت قدس سرہٗ کے سامنے اسی حالت میں کھڑا ہوا پایا اور حضرت کو بھی اسی طرح نقطہ بناتے ہوئے منہمک دیکھتا رہا۔ جب حضرت قدس سرہٗ نقطہ بنا کر فارغ ہوئے تو مظفر شاہ سے آنے کا سبب دریافت فرمایا: مظفر شاہ سے کچھ جواب نہ بن پڑا تھوڑی دیر سر جھکائے آپ کے سامنے ادب سے بیٹھ کر دعا کا طالب ہوا اور رخصت کی اجازت چاہی۔

تاریخ روایات کے اس پس منظر میں شاہانِ گجرات و دہلی کے غیر مستقل حکمرانوں کے واقعات ہمارے سامنے ہیں اور اسی ماحول میں حضرت سید شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کے شام وسحر سے، کچھ واقعات کا انتخاب احتیاط اور پوری ذمہ داری سے کر کے زیب قرطاس کیا گیا جس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ اس دور کے تمام صوفیائے ہند میں آپ کا مقام ہر حیثیت سے منفرد تھا۔ عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری نے لکھا ہے:

> "شاہ علی جیو گاؤں دھنی رحؒ کی شان و عظمت تمام علما و مشائخ میں بڑھی ہوئی تھی۔ سب آپ کی کرامت و ولایت کے معترف تھے۔ آپ اکمل الاولیا و افضل المشائخ تھے۔ آپ کے آفتاب جمال کے مقابلے میں کسی کا چراغ روشن نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ آسمانِ ولایت کے آفتاب تھے اور دوسرے بزرگ ستارے تھے۔ شیخ محمد غوث رحؒ نے بھی آپ کی بزرگی و عظمت کو تسلیم کیا۔ آپ سے نیازمندانہ ملاقات کرتے جب تک گجرات میں رہے آپ کی خدمت میں آتے رہے اسرار و معرفت رموز و حقیقت میں باہم

مذاکرہ رہتا۔"[1]

تذکرہ نگاروں نے حضرت شاہ علی جیوگام دھنی قدس سرہٗ کے حالاتِ زندگی بیان کرنے میں بخل سے کام لیا اور اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اکثر و بیشتر نے صرف آپ کے دیوان اور وحدت کے نام گرامی کی شرحت سرکے چپ سادھ لی۔ کسی نے دو چار جملے بڑی سعادت مندی سے سپردِ قلم کر کے تذکرہ نگاری کے احسان دھرا تو کسی نے انھیں جملوں میں قدرے رد و بدل کر کے زہانت سے کام نکالا۔ غوثی مندوی سید شاہ محمد غوث گوالیری نے لکھا ہے:

"زبانش جز نفس توحید نسرودی، خامہ اش جز اشعارِ موحدانہ نہ نگاشتی، دیوانے دارد بہ ہندی زبان در روش معنی برابر دیوان مغربی است از نبیرۂ سید احمد کبیر رفاعی است قدس سرہٗ"[2]

تحفۃ الکرام کا بیان ہے:

"نبیرۂ سید عبدالرحیم مزبور جز نفسِ توحید نسرودی دیوان دارد بزبان ہندی در روش معنی برابر دیوانِ مغربی است۔ روضہ ایشان در رائکھیڑ متصل روضۂ شاہ غزنی واقع است۔ یازدہم الیشان چہاردہم جمادی الاول سال نہ صد ہفتاد و سہ رحلت مقرر است۔ مدتِ عمر او ہفتاد و ہفت سال۔"[3]

جناب محمد حسن نے لکھا ہے:

"دیوانے دارد بہ زبانِ ہندی در روش و معنی برابر دیوانِ مغربی است۔"[4]

یہی دو چار جملے ان تذکرہ نگاروں نے ایک دوسرے کا بیان نقل کر کے لکھ دیے اور بعد کے وقائع نگاروں نے

[1] محبوب ذی المنن فی تاریخ اولیائے دکن، محبوب التاریخ ص ۲۹۲

[2] گلزارِ ابرار فی سیر الاخیار مخطوطہ محزونہ سالار جنگ ورق ۹۹، حوالہ ع ۲۵۹ محررہ ۱۲۱۳ھ

[3] تحفۃ الکرام جلد اول ص ۱۲

[4] مرآۃ احمدی جلد دوم ص ۱۲

نہی جملوں اور چند سنی سنائی کرامتوں کو بیان کر کے تذکرہ نویسی کا حق ادا کر دیا۔

میری معلومات کا ماخذ کتاب شجرۃ الاحدیہ، ملفوظاتِ شیخ عبدالرحمان العمودی، ملفوظاتِ شاہ عبدالرحیم بھی ہے جو بڑودہ و احمد آباد کے روضات کے سجادگان کے پاس محفوظ ہیں۔

حضرت سیدی شاہ علی محمد جیوگام دھنی معشوق اللہ قدس سرہٗ صاحبِ سلسلہ بزرگ تھے۔ درس و تدریس، رشد و ہدایت، خدمتِ خلق آپ کے دلچسپ مشاغل تھے۔ ذکر و اذکار، ریاضت و عبادت کے بعد جو وقت آپ کے آرام کا ہوتا اس وقت کو بھی آپ مریدوں کی تعلیم و تربیت میں صرف کرتے۔ آپ طبعی طور پر خلوت پسند تھے لیکن ذریعہ معاش چونکہ زراعت تھا اس لیے آپ اکثر اپنے کھیتوں کی طرف تشریف لے جایا کرتے۔ مشہور ہے کہ آپ کے کھیت جب پک کر تیار ہو جاتے تو وہاں پر عجیب و غریب و ہمہ رنگ و ہر قسم کے بے شمار پرندے جو عام طور پر کہیں دکھائی نہیں دیتے، اڑ اڑ کر پہنچ جاتے اور ان کھڑی فصلوں سے اپنی غذا حاصل کرتے۔ شاہ صاحب قدس سرہٗ، کھیتوں میں کھڑے دور و نزدیک کے بڑے بڑے درختوں کی شاخوں پر ان پرندوں کے لیے پینے کا پانی بھی برتنوں میں بھروا کر آویزاں کر دیا کرتے تاکہ یہ پرندے بے خوف ہو کر یہاں سے پانی بھی پالیں۔ آپ کا ایک شعر ہے:

ہے شاہ علی جیو گام دھنی نت آوے اپنی کھیت کھنی

ذکرِ الٰہی سے آپ کا کوئی لمحہ خالی نہ ہوتا، خلوت ہو کہ جلوت کسی سے ہم کلام ہوں کہ محوِ کام آپ کا قلب یادِ الٰہی کے ساتھ ساتھ دھڑکتا رہتا بلکہ ہر دھڑکن یادِ الٰہی کا پیش خیمہ ہوتی۔ ذکرِ الٰہی سے جب آپ سرشار ہوتے تو محویت طاری ہوتی اور اسی عالمِ محویت میں زبانِ حق ترجمان سے عارفانہ

نکات معرفت ارشاد فرماتے جنھیں آپ کے خدام و خلفا ضبطِ تحریر کر لیتے ، کبھی خود آپ بھی اپنے دستِ مبارک سے ان جگر پاروں کو لکھ لیتے ۔

مکتوبات چشتیہ کے ورق ۲۳۵ کے حوالے سے حافظ محمود شیرانی مرحوم نے ، مخدوم بہاء الدین باجن کے خاندانی ماخذ کے ورود گجرات اور حضرت سید شاہ علی جیوگاؤں دھنی قدس سرہ کے مہمان رہنے کا ذکر کیا ہے ، اس قیام کے زمانے میں حضرت قدس سرہ نے نہ صرف انھیں اپنا کلام سنایا بلکہ دیوان کی ایک نقل بھی ہدیہ کی تھی ۔ ۱؎

آپ کے کلام کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہو جاتا ہے کہ دکن کا منفرد نثر نگار ملا وجہی اپنی معروف تصنیف " سب رس " میں حضرت شاہ علی جیوگاؤں دھنی قدس سرہٗ کا ایک شعر نہایت ادب و احترام و عقیدتمندانہ جذبے سے نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے :

" ہور واصلِ حق ، عاشق مطلق گجراتی شاہ علی ، خدا کے
لاڈے ، خدا کے خاصے ، خدا کے ولی ، دائم خدا سوں مل
رہے ، انو بی یو بچ کہے اس بیت

ہب علے چتر کہے سبھی سب وہی وہی سب وہی وہی ۲؎

حقیقت ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت سیدی شاہ علی جیوگاؤں دھنی قدس سرہٗ نے اپنے کلام میں سوز و گداز ، رموز و نکات ، اسرار و افکار کا جو وافر مواد فراہم کیا ہے اور مناسب اور موزوں تمثیلوں سے بیان میں جو زور پیدا کیا ہے اس کی مثال بہت کم کہیں ملتی ہے ۔

جواہر اسرار اللہ واردات قلب ، معارف و حقائق الہیہ کا ایک مکمل صحیفہ ہے

۱؎ مقالات شیرانی جلد اول صفحہ ۱۴۹

۲؎ سب رس صفحہ ۳۲

ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ روح کی آواز ہے جو اپنی اس سے بچھڑ کر جدائی کے گیت
دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہو یہ صدا در اصل کبھی خلوت گزینی کے پاکیزہ لمحات کا اظہار ہے
کبھی قدرت غیبی اور معرفتِ الٰہی کا اظہار کبھی۔ جوہر سر اللہ حقیقتاً وجدان کا نہ ختم ہونے والا
دل ہو کر دینے اور روح کو تڑپا دینے والا وہ گنجینہ ہے جو یہ قدرت کبھی کبھی اپنے برگزیدہ بندوں کے
قلب کو تفویض کر کے ایسے شہ پاروں کا نزول کرتا ہے۔ یہ ایک طرح سے اہلِ دل کی تسکین اور اہلِ بصیرت
کے لیے حدیثِ تحسین ہے۔ باوجود چار سو سال پرانی زبان ہونے کے اس کا لحن و آہنگ آج
بھی کانوں میں رس گھولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے تحت اللفظ پڑھنے
سے یا وہ اس کے صحیح تلفظ و ترنم کے ساتھ سننے میں مزہ آتا ہے اور ایک عجیب سرور آمیز کیفیت
پیدا ہوتی ہے۔ دل محبتِ الٰہی کے جذبات سے سرشار ہو کر جھوم اٹھتا ہے اور روح وجد کرنے لگتی ہے۔
یہی تحیراتی کیفیت اردو زبان کے کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ محمود شیرانی کا یہ بیان کہ

"جوہر سر اللہ کی زبان ہمارے لیے خاص طور پر مشکل ہے اول تو
یہ اب سے چار سو برس پہلے کی زبان ہے اور وہ بھی گجرات کی اس
کے علاوہ اس میں گجراتی الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔
ان امور نے شاہ صاحب کی زبان کو دقیق بنا دیا ہے" [۱]

تاریخاً صحیح نہیں ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہ کی زبان نسبتاً اور شعرائے دکن و ہمعصر صوفیائے گجرات
نسبتاً ان کا کلام کے نہایت سہل و آسان ہے، بلکہ بعض الفاظ جو اس میں استعمال ہوئے ہیں وہ
آج بھی ہماری زبان میں مستعمل ہیں۔ مثلاً یہ شعر

گھڑی ایک جیسی دنیا ساری — جان سو سو دھی جھولوں تواری [۲]

۱ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی، جلد اول
۲ تواریخ منجی کرکسا کرتا

بات اُنوں کی جانو بھاری

پیوکوں جے بسر اوے ہیے   دنیا ناؤں اُسی کا کہیے

سری دئیں بھولاے نہ ہیے

یعنے جنھوں تے دنیا کی محبت ترک کی اُنکی کی بات لایق اعتنا و یا وزن ہے
وہ جو شئے کہ خدا کو فراموش کرادے اسی کا نام دنیا ہے اور یہ اتنی گندی ہے کہ اس
سے محبت نہیں کی جاسکتی ۔ ؎

چیست دنیا از خدا غافل بودن   نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

فی الواقع یہ ایک ایسا متنوع ، رنگا رنگ اور سحر کن کلام کا مجموعہ ہے کہ اسے پڑھتے جائیے
اور جس قدر اور جتنا پڑھیے سیری نہیں ہوتی۔ اس کی اثر آفرینی کا یہ عالم ہے کہ اس کے ہر شعر پر
دستبوم قبوم اٹھتا ہے اگرچہ یہ الٰہیاتِ اسلامی کے "تصوّرِ وحدت الوجود" کے ضمن میں بھی یہ کہہ کر پیش
کیا جاتا ہے کہ " دیوان کی اکثر و بیشتر نظموں کا موضوع مسئلہ وحدت الوجود ہے " [1] لیکن
یہ مجموعۂ رشد میں سرتا سر عشق و محبت ہی کا بیان ہے۔ اسے وارداتِ قلبی کا اظہار کہہ لیجیے یا وارفتگی
بے ساختگی کا تجرباتی بیان ، یہ علم و عرفانِ الٰہی کا وہ نسخہ اور صحیفۂ تخیّلات ہے جو نئے نئے طرح سے مرتب و مزین ہوا اور ہر مرتبہ
نئی شان اور نئے ڈھنگ سے سرچڑھ کر بولتا رہا۔ ہجر و وصال کا مضمون ہو کہ کرب و آزمائش
یا بات دونوں ہی جگہوں میں اثر انگیزی سحرِ حلال تک جا پہنچتی ہے۔ اس میں تصوف کے مسائل
بھی ہیں تکشفت کے مراحل بھی ، فرائض و سننِ شرع کا بیان بھی ہے ذکر و اذکار تلقین و ترغیب کی تفصیل
بھی ہے ، تخلیقِ کائنات ، رسم و رواج ، ریت و روایت ، مسائلِ ضروریاتِ دین ، تذکارِ میلاد النبی و معراج
النبی صلی اللہ علیہ وسلم ، فضائلِ صحابہ ، تذکرہ ائمہ ، تکریم ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن ، مناقب اولیائے کرام زینت و زیبِ قرطاس ہیں۔

[1] مقالاتِ شیرانی جلد اول ص ۱۸۱

صوفیانہ اخلاق کی تعلیم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو جواہر اسرار اللہ کے صفحات کی سج دھج کا آئینہ نہ ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں پہنچ کر مسائلِ تصوف کی شان ہی کچھ اور ہوگئی ہے۔

حضرت سیدی شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ نے اپنا یہ کلام خود مرتب و مدوّن فرمایا تھا۔ اس وقت آپ کے اس مدوّنہ مجموعہ کو عام طور پر "دیوانِ سید علی گاؤں دھنیؒ" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ دراصل حضرت قدس سرہٗ نے اسے اپنے مریدوں اور مبتدیانِ مسلکِ صوفیا کی تعلیم و تربیت کے لیے تحریر فرمایا تھا۔ کبھی دورانِ درسِ قرآن، حدیث و فقہ دلیل کی ضرورت پیش آتی تو آپ فی البدیہہ اشعار فرماتے بعد میں وہی نظم کی شکل میں شاملِ دیوان ہو کر تسکینِ قلب و ازدیادِ ایمان کا سبب بن جاتے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے اپنے دستِ مبارک سے اس دیوان کی ترتیب و تدوین فرمادی تھی۔ آپ کے دستِ مبارک کا مدوّنہ اور محررہ یہ نسخہ نہروالہ (پاٹن) گجرات میں نہایت بوسیدہ و کرم خوردہ قاضی شہر کے پاس موجود تھا اب اس کا پتہ نہیں چلتا۔ حضرت قدس سرہٗ نے اس دیوان کی نقول بعض صوفیا کرام کی خواہش پر عنایت فرمائیں۔ آپ نے اس کی تدریس سنہ ۹۷۱ھ میں باقاعدہ اوقات درس مقرر کر کے شروع فرمائی تھی۔ شیخ عبدالرحمان العمودی رحمۃ اللہ علیہ نے ملفوظاتِ خاندانی میں لکھا ہے،

"تاریخ شروع کردن درسِ جواہر اسرار اللہ شاہ علی محمد معشوق اللہ تعالیٰ
سنہ احدی و سبعین و تسعمائۃ" لہ

درس شروع کرنے کے اس موقع پر حضرت سید ابراہیم مرید و خلیفہ حضرت سید مصطفیٰ حبیب اللہ مرتبِ جواہر اسرار اللہ نے ایک فارسی قطعہ تحریر فرمایا تھا جس کے مصرعۂ آخر کے الفاظ "بالدرس قد شرع" سے ۹۷۱ھ تاریخِ ہجری برآمد ہوتی ہے۔ سلطان العارفین کو سید علی محمد کردہ شروع درسِ علم علی و احمد
تاریخ او چو خواہی ابراہیم زود ازین اخلاص "بالدرس قد شرع" تا یابی تو زود مقصد
۹۷۱

لہ مخطوطہ مخزونہ و مملوکہ سجادہ صاحب "روضۂ گاؤں دھنی" احمدآباد۔

آپ کا یہ دیوان اُس وقت صرف ایک شعری بیاض کی شکل میں تھا۔ نہ ہی اس پر کوئی دیباچہ یا متنِ کتاب کے بارے میں کوئی مضمون لکھا گیا تھا بعد میں سید ابراہیم والی الحسن شیخ محمد بن عبدالرحمان القریشی الاحمدی نے دیوان کی ہمہ جہتی اہمیت و افادیت کو پیشِ نظر رکھ کر ایک نہایت پُرمغز و بصیرت افروز دیباچہ سپردِ قلم کر کے اس دیوان کا نام حضرت کی ایماء پر "جواہر اسرار اللہ" رکھا۔ ان کا بیان ہے:

"آنحضرت بلسانِ دُرربار جوہر نثار بطریقِ نظم بالفاظِ گوجری،
بہ زبانِ مبارک خود فرمود، در اثباتِ توحید و وجودِ واحد با دلائلِ
عقلی و برہانِ نقلی و تمثیلات آں دریں مختصر آوردہ جمع کردہ
شد و آں ملفوظ را بکتاب جواہر اسرار اللہ تعالیٰ نام داشتیم۔"[1]

جواہر اسرار اللہ کے دونوں مرتبین کے بارے میں تقریباً سبھی محققین کی معلومات غلطی پر مبنی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک کے بیان کو دوسرے نے نقل کر دیا تحقیق کی زحمت گوارہ نہیں کی مرتبین کے بیانات کا جائزہ لینے پر معلوم ہوگا کہ کس نے کہاں غلطی کی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا بیان ہے:

"گام دھنی نے اپنی یادگار میں ایک اردو دیوان چھوڑا ہے جس کو
پہلے ان کے دادا کے مرید ابوالحسن شیخ محمد نے ترتیب دیا بعد ازاں
خود اُن کے پوتے سید ابراہیم ولد شاہ مصطفےٰ نے دوبارہ اس کو مرتب کیا۔"[2]

حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں:

"جواہر اسرار اللہ کی دو اشاعتیں ہیں، پہلی اشاعت جو مصنف
کی زندگی میں تیار ہو چکی تھی، ان کے مرید شیخ حبیب اللہ ابنِ عبدالرحمان

[1] دیباچہ جواہر اسرار اللہ مرتبِ اول ص۲ مخطوطہ مخزونہ سالار جنگ حیدرآباد

[2] اردو شہ پارے جلد اول ص۱۲۱

القریشی الاحمدی نے کی ہے۔ دوسری اشاعت کے مالک مصنف کے

نبیرہ سید ابراہیم ابن شاہ مصطفٰے حبیب اللہ ابنِ شاہ علی محمد ہیں

جو آپ کے مرید بھی ہیں"۔ ۱؎

نصیر الدین ہاشمی نے تحریر کیا ہے:

"جواہرِ اسرار اللہ دراصل آپ کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں تصوف

کے اسرار و مسائل کو نظم میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کو پہلے آپ

کے مرید شاہ ابوالحسن نے مرتب کیا اس کے بعد آپ کے پوتے

شاہ ابراہیم ابنِ شاہ مصطفٰے نے دوبارہ ترتیب دیا"۔ ۲؎

حبیب شرف ندوی رقمطراز ہیں:

"شاہ صاحب کا کلام دو مرتبہ اشاعت پا چکا ہے۔ پہلی

مرتبہ اس کو ان کے ایک مرید ابوالحسن فتح محمد ابن عبدالرحمان القریشی

الاحمدی نے مرتب کیا ـــــ چونکہ اس اشاعت کا دیباچہ

مختصر تھا اس لیے معتقدین کے کہنے سے ان کے پوتے شاہ

ابراہیم نے اس پر مبسوط دیباچہ لکھتے ہوئے اس کی پہلی

اشاعت کا ذکر ہی نہیں کیا"۔ ۳؎

ڈاکٹر جمیل جالبی انشا پرداز ہیں:

"کاملِ دکنی کا کلام پہلی مرتبہ ان کے ایک مرید ابوالحسن ابن عبدالرحمٰن

قریشی الاحمدی نے مرتب کیا اور اس کا نام جواہر اسرار اللہ رکھا۔

۱؎ مقالاتِ شیرانی جلد اول ص ۱۸۰

۲؎ اردو مخطوطات جلد دوم ص ۱۸۱

۳؎ علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۱۰۱

دوسری مرتبہ ان کے پوتے سید ابراہیم ابن شاہ مصطفٰے نے اسے

مرتب کیا"۔ ؎۱

سید ظہیر الدین مدنی نے لکھا ہے:

"جواہر اسرار اللہ کو دو مرتبہ دو مختلف حضرات نے مرتب کرکے
شائع کیا تھا پہلی دفعہ شاہ صاحب کے ایک مرید شیخ حبیب اللہ
بن عبدالرحمان القریشی الاحمد آبادی نے ایک مختصر دیباچے کے
ساتھ شائع کیا اور دوسری بار شاہ صاحب کے نبیرے سید ابراہیم
ابن شاہ مصطفٰے حبیب اللہ ابن شاہ علی محمد نے طویل عربی و
فارسی دیباچے کے ساتھ شائع کیا"۔ ؎۲

مندرجہ بالا بیانات اُن ثقہ محققین کے ہیں جن کا نام ہی کسی حوالے کے معتبر ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن یہ بڑی حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ تحقیق کے معاملے میں ان سب کے قدم اس میدان میں لڑکھڑا گئے۔ محی الدین قادری زور نے مرتب اول، ابی الحسن شیخ محمد ابن عبدالرحمان القریشی کو حضرت شاہ علی جیو گاؤں دھنی کے دادا کا مرید لکھا ہے۔ جبکہ دوسرے تمام محققین نے انھیں شاہ صاحب کا ہی مرید بتایا ہے۔ محمود شیرانی مرحوم نے مرتب اول کا نام شیخ حبیب اللہ ابن عبدالرحمان القریشی الاحمد آبادی لکھا ہے اور نصیر الدین ہاشمی نے انھیں صرف شاہ ابوالحسن ہی لکھنے کو کافی سمجھا۔ نجیب اشرف ندوی نے ابوالحسن شیخ محمد ابن عبدالرحمان القریشی الاحمدی لکھ کر جدت پیدا کی ہے تو جمیل جالبی نے ابوالحسن ابن عبدالرحمان قریشی الاحمدی لکھ کر جملے کو مختصر کیا۔ ظہیر الدین مدنی نے محمود شیرانی کے تتبع میں شیخ حبیب اللہ ابن عبدالرحمان القریشی لکھ کر الاحمد آبادی لکھا۔ ممکن ہے سہو کتابت سے "الاحمدی" الاحمد آبادی ہو گیا ہو

؎۱ تاریخ ادب اردو جلد اول ص۱۱۲ دوم ص۱۱۵

؎۲ مقدمہ ... ص۹

میرے پیش نظر، جواہر اسرار اللہ کے آٹھ نسخے ہیں۔ یہ نسخے مختلف کاتبوں کے ہاتھ کے تحریر کردہ ہیں۔ ان میں تین نواب سالار جنگ کے کتب خانے کی زینت ہیں، دو کتب خانہ آصفیہ، دو کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد گجرات اور ایک سجادہ صاحب روضہ گاؤں دھنی کی ملوکہ ہے۔ ان سب میں کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد کا نسخہ قدیم تر ہے۔ یہ نسخہ جس کی پیشانی پر "علیم الدین تاجر کتب" لکھا ہوا ہے نامکمل اور کرم خوردہ ہے اس کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ اس کا دیباچہ مختصر لیکن مرتب اول کا لکھا ہوا ہے جس نے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

"بندۂ فقیر یکی از کمینہ مریدان و خاکروبان تاج العاشقین شاہ
عمر مظہر اللہ ابن حضرت غوث الثقلین شاہ علی نور اللہ، المسمی
ابی الحسن شیخ محمد بن عبد الرحمان القریشی الاحمدی"۔

اس دیباچے میں مرتب نے واضح طور پر بیان کر دیا کہ وہ حضرت شاہ عمر مظہر اللہ کا مرید ہے جو حضرت شاہ علی جیو گاؤں دھنی کے دادا تھے (ڈاکٹر زور کا بیان بھی اس کی تائید کرتا ہے۔) ابی الحسن شیخ محمد عبد الرحمان القریشی الاحمدی کی مریدی کی بات مزید مستحکم ہو جاتی ہے جب شجرۂ الاحمدیہ میں ان کا نام حضرت شاہ عمر مظہر اللہ کے مریدوں کے سلسلے میں درج ملتا ہے۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے اور ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ابی الحسن شیخ محمد ابن عبد الرحمان القریشی الاحمدیؒ، حضرت سیدی شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کے مرید نہیں تھے بلکہ ان کے دادا کے مرید خلیفہ تھے۔[۱] حافظ محمود شیرانی مرحوم نے دوسری بڑی غلطی یہ کی کہ مرتب اول کا نام شیخ حبیب اللہ بن عبد الرحمان القریشی الاحمدی لکھ دیا اور اسی کو ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے بھی تحقیق کیے بغیر اپنی کتاب سخنوران گجرات میں نقل کر دیا۔ نام کی ایسی ترکیب نہ کسی محقق کے ہاں ملتی ہے اور نہ ہی کسی جواہر اسرار اللہ

[۱] مخطوطہ شجرۂ بیعت ... سید کمال الدین رفاعی بڑودہ گجرات۔

کے نسخے میں پائی جاتی ہے اور نہ ہی کسی نے "شیخ حبیب اللہ" کو مرتبِ اول کی حیثیت سے تحریر کیا ہے۔ نجیب اشرف ندوی کے مضمون مشمولہ علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو، یہ نام "ابی الحسن فتح محمد" لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے کمپوزنگ کے باعث "شیخ" "فتح" سے بدل گیا ہو۔ تیسری سب سے بڑی اور تحقیقی بات جو سب کی غلطی کے ارتکاب کا سبب بنی "سید ابراہیم ابن مصطفےٰ حبیب اللہ ابن شاہ علی محمد" ہے۔ ہر ایک نے مصطفےٰ حبیب اللہ کو حضرت سیدی شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کا صلبی بیٹا سمجھا اور سید ابراہیم کو ان کا پوتا جانا۔ حقیقتاً حضرت سیدی شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کے کوئی اولاد ہی نہیں تھی۔ ہاں آپ کے خلفا ہوئے اور بڑا نام پیدا کیا۔ خلفا کی ایسی تعداد جنھوں نے آپ سے تلقین و تعلیم پائی حدِ شمار سے باہر ہے لیکن ان سب میں سے صرف چند ہی خلفا کو بیعت لینے اور شجرۂ طریقت دینے کی اجازت تھی۔ انہی میں سے ایک آپ کے خلیفہ و متبنیٰ شیخ عبدالقادر العمودی قدس سرہٗ ہیں، جو حضرت شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کے وصال کے بعد آپ کی مسند پر فائز ہوئے اور صاحبِ سجادہ کہلائے[۱] اور دوسرے حضرت سید مصطفےٰ حبیب اللہ ہیں۔ انہی مصطفےٰ حبیب اللہ کے مرید و خلیفہ حضرت سید ابراہیمؒ تھے جنھوں نے جواہرِ اسرار اللہ کو مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ حضرت سید مصطفےٰ حبیب اللہ کے ایک اور خلیفہ حضرت سید شاہ عبدالقادر علی جیو ز در اللہ ہیں جنھیں غلطی سے بعضوں نے جواہرِ اسرار اللہ کا مصنف سمجھا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ شاہ علی جیو ز در اللہ کا یومِ وصال غلطی سے حضرت شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ سے منسوب ہو گیا ہے اور اسی منسوب کردہ تاریخ پر آپ کا عرس بھی ہوتا ہے۔

صوفیائے کرام کی مجلس کا ایک دستور ہے اور یہ اس طرح ان کے اصول و طریقے کی ایک بات ہے کہ عطائے خرقۂ خلافت یا جانشینی کا اعلان خواہ صلبی اولاد ہو یا نہ ہو، فقراء کی موجودگی میں جسے خلافت دی جاتی ہے، صدرِ فقراء جسے اصطلاحاً "حبال اللہ" کہا جاتا ہے اس طرح "خلیفہ" ہونے کا

[۱] شجرۂ سہروردیہ ... محمودیہ ... و ... حضرت شاہ گاؤں دھنی ... حضرت شیخ عبدالقادر العمودی کے اسمِ گرامی کے ساتھ "خلیفہ و متبنیٰ و صاحبِ سجادہ حضرت شاہ علی جیو گاؤں دھنی" لکھا ہوا ہے۔ ... صفحہ ۴۳۰ ...

اعلان دف بجاکر کرتا ہے کہ "آج فلاں شہنشاہِ ولایت کے گھر فلاں شہزادہ پیدا ہوا۔" ——— یہ حقیقت ہے کہ صوفیائے کرام کے نزدیک جسم کی حیثیت فنا ہو جانے والی شئے کی طرح ہے۔ روح کو چونکہ فنا نہیں اور اسے بقائے لقا البقا سے باقی رکھنے کے لیے اس کی تربیت ضروری ہوتی ہے اس لیے صوفیائے کرام تزکیۂ نفس کے مرحلے کے سبب تجلیۂ روح پر زور دیتے ہیں اور بوقتِ خلافت جسم کو مردہ و فنا جان کر نئے جسم کے پیدا ہونے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ یہ نیا جسم تابع روح اور قدسی صفات کا حامل ہو کر مرشد کا دم قدم بن جاتا ہے جہاں اس میں مرشد کی تمام خوبیاں پیدا ہو کر اسے مسندِ رشد و ہدایت کے لائق بنا دیتی ہیں۔ اسی لیے اسے خلافت پہلے دی جاتی ہے اور خلف بعد میں کہا جاتا ہے اور آوازہ بلند کرتے وقت بجائے خلیفہ کہنے کے اسے "ابنِ فلاں" کہہ کر ہر موجود متنفس کو گواہ بنالیا جاتا ہے جس کے بعد ہونے والا جانشین و خلیفہ خود اپنے آپ کو مرشد کی روحانی اولاد سمجھتا ہے اور اپنے شجرۂ طریق میں اپنے نام کی صراحت "ابنِ مرشد" لکھ کر کر دیتا ہے جیسا کہ جواہر اسرار اللہ کے دیباچے میں مرتبین نے کیا ہے جس کی وجہ سے ہر ایک مغالطے کا شکار ہو گیا اور ہر محقق نے یہی سمجھا کہ جواہر اسرار اللہ کے مرتبِ ثانی حضرت سید شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کی حقیقی و صلبی اولاد کے بیٹے ہیں۔ جیسا کہ نجیب اشرف ندوی نے شاہ مصطفےٰ حبیب اللہؒ کے دو خلفاء کا ذکر بحیثیتِ اولاد اپنے مضمون میں کیا ہے:

> "شاہ صاحب کے صاحبزادے کا نام سید شاہ مصطفےٰ حبیب اللہ تھا۔ ان کے دو صاحبزادوں کا حال معلوم ہے۔ سید عبدالقادر شاہ علی جیونا داں اللہ اور جواہر اسرار کے مرتب شاہ ابراہیم معرفت اللہ۔"[1]

[1] علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۱۰۲

لیکن تحقیق سے یہ کہیں ثابت نہ ہو سکا کہ شاہ مصطفےٰ حبیب اللہ، حضرت سید شاہ علی جیو گاودھنی رح کے صلبی بیٹے تھے اور نہ ہی آثار و قرائن سے یہ معلوم ہوا کہ سید شاہ عبدالقادر شاہ علی جیو نائب اللہ اور سید ابراہیم ان کے پوتے ہیں۔ نجیب اشرف ندوی مرحوم نے ایک اور غلطی یہ کی کہ سید ابراہیم کا لقب معرفت اللہ لکھ دیا ہے حالاں کہ ان کا لقب "ضیاء اللہ" ہے۔[۱]

جواہرِ اسرار اللہ کے قلمی نسخے

دنیا بھر میں جواہر اسرار اللہ کے بے شمار قلمی نسخے مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے لکھا ہے کہ اس کا ایک

"خوش خط اور مکمل نسخہ پرنسٹن یونیورسٹی (ریاست ہائے متحدہ امریکہ)
کی لائبریری میں موجود ہے"[۲]

نجیب اشرف ندوی کے پاس بھی اس کا ایک نسخہ موجود تھا لیکن دریافت پر معلوم ہوا کہ ان کے ذخیرۂ کتب سے کسی نے اسے اڑا لیا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں بھی اس کی ایک نقل کے موجود ہونے کا ذکر جناب نصیر الدین ہاشمی نے کیا ہے۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی میں اس کے دو نسخوں کا ہونا معلوم ہوا جس میں سے ایک قدیم تر ہے۔ میرے ایک دوست نے اطلاع دی کہ یہ نسخے اس قدر بوسیدہ و کرم خوردہ ہو چکے ہیں کہ ان کی زیراکس بھی نہیں بن سکتی۔ کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد گجرات میں دو نسخے موجود ہیں، کتب خانہ نواب سالار جنگ حیدر آباد میں تین نسخے اور سجادہ صاحب روضہ گاودھنی قدس سرہٗ کے پاس موجود ایک نسخہ نہایت صاف خوش خط اور مکمل حالت میں ہے۔ اس نسخے کے بارے حضرت عبدالرحمان[۳] العمودی رح کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نہایت کارآمد اور مفید مطلب تحریر میرے ہاتھ لگی جس کی نقل میں نے حاصل کر لی۔

۱ تجرۃ الاطہریہ
۲ علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۳۲
۳ حضرت عبدالرحمان العمودی رح اورنگ آباد گاؤدھنی قدس سرہٗ کے سجادہ تھے آپ کا وصال ۱۳۳۰ھ میں ہوا۔

...مون اول ہے:

الحمدللہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام
علی رسولہ نبی الکریم۔ اما بعد صلاحیت کردار سعادت اطوار صادق
الیقین .... رحمۃ اللہ برکاتہٗ، بعد دعائے خیر کہ معلوم ہو
کہ مجھے احمد آباد آئے ہوئے تقریباً چار ماہ ہوئے۔ قبل اس کے میں نے
تمھیں بلدِ محروسہ پٹن، دو رقعہ لکھے جس میں تحریر کیا تھا کہ جس
طرح ہو جلد از جلد دیوانِ جواہرِ اسرار اللہ کا نسخہ منظومات زبانِ
گجری اور کچھ حالات نثر عربی و فارسی پر مشتمل ہے میں نے اپنے
مکان بلدِ محروسہ پٹن میں شہرِ مولود، آخر تحریر پر ختم کیا تھا دیوان
کے کل صفحات ۱۹۴ نمود ہے۔ اول مقدمات دو صفحے میں نے
یہاں احمد آباد میں تحریر کر لیے ہیں۔ یہ نسخہ میرے پاس سے شہر
قاضی پٹن بغرضِ مطالعہ کے لے گئے تھے۔ وہ تمھارے خط سے
معلوم ہوتا ہے کہ تم کو واپس دے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ نسخہ یہاں واپس
بھیج دو اس پر میری مہر کرنا بھی باقی ہے۔ مقدمات کے صفحات
شامل کر کے میری مہر وغیرہ ثبت کر کے دیوان کی جلد سازی بھی
کر لی جائے تاکہ دیوان مکمل اور محفوظ ہو جائے۔ اصل نسخۂ دیوان قبلہ
جدی حضرت قطب الاقطاب سیدنا شاہ علی محمد گام دھنی رفاعی رحمۃ اللہ علیہ
کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ہے جو یہاں میرے پاس موجود ہے۔

نہایت ضعیف ہو چکا ہے اور جگہ جگہ سے اس کے اوراق بہت
بوسیدہ ہو کر کٹ گئے ہیں جس کے پڑھنے میں بہت دقت محسوس
ہوتی ہے یہ تواب میں نے اپنے مریدین و متعلقین کی زیارت
کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ حضرت قبلہ جدی قطب الاقطاب کے عرس
شریف پر زیارت کے لیے آپ کا خرقۂ مبارک اور آپ کے والدِ
محترم حضرت قطب الواصلین سید ابراہیم منظہرِ جمال اللہ کا عَلَم مبارک
جو سنہ ۹۱۴ کا بنا ہوا ہے اصل دیوانِ شریف، یہ تمام تبرکات
بغرضِ زیارتِ عوام روضۂ مبارک اور اپنے مکان پر رکھتا ہوں
تاکہ تمام زیارت سے مستفیض ہوا کرے و نیز معمولات سال بہ
سال کے مطابق اس سال ماہِ رمضان المبارک میں مریدین
و متعلقین کی آمدنی جو تمہارے پاس جمع ہوئی ہو، وہاں کسی طرف
طرف روانہ نہ کریں بلکہ اس سے ہمارے حجرے اور مکانات
کی مرمت کریں۔ مریدین کی تعلیم و تلقین کا ہمیشہ خیال رکھیں یہ
رقعہ جو میرے چھوٹے بھائی سیدنا شیخ عمر کو تمہارے نام لکھ کر دیا
ہے تم پڑھ کر دیوان اور رقعہ وغیرہ تمام اس کو واپس کر دو۔ دیوان کا
خاص خیال رکھیں کیوں کہ اس کے اوراق علحدہ علحدہ ہیں کہیں رہ نہ
جائیں ان کی تعداد ۱۶۴ ہے کہیں کمی و بیشی نہ ہو۔ والسلام
علیٰ من اتبع الہدیٰ۔ تحریر فی التاریخ ۱۳ شہر شعبان

سنہ ۱۲۲۱ھ دعاگو احقر العباد ؎

الشیخ عبدالرحمان بن شیخ عمر بن محمد العمودی الرفاعی
القادری صاحب المنصب، سجادہ من الطریقۃ المشائخ
العمودی المغربی الرفاعی القادری عفی عنہ۔

خط کے مطالعہ سے چند معلومات حاصل ہوئیں۔ ایک یہ کہ یہ دیوان حضرت سیدی شاہ علی جیو گاؤں دھنیؒ
کے دستِ مبارک کے لکھے دیوان کو ضائع ہو جانے سے بچانے کے لیے اُسے پیشِ نظر رکھ کر مرتب کرایا گیا
تھا اور اُسے بطورِ تبرک محفوظ کر لیا گیا تاکہ مریدِ و متعلقینِ سلسلہ اس کی صرف زیارت کر لیں چونکہ اصل دیوان جو
حضرت قدس سرہٗ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہایت بوسیدہ ہو کر بہ تکلف پڑھا جا سکتا تھا اس لیے حضرت
شیخ عبدالرحمان العمودیؒ نے اس کے متن کے تحفظ کی خاطر اسے از سر نو مرتب و مدون کر کے رکھ لیا تھا۔
جس کی حفاظت کا ذکر بار بار انھوں نے اپنے خط میں بھی کیا ہے۔ یہ مرتبہ دیوان جس کی میں نے نقل لے لی ہے
میرے نقل کر لینے تک بھی جلد بندی کے حُسن سے محروم تھا اور ابتدائی مقدمے کے دو صفحات
بھی اس کے ساتھ موجود نہ تھے جس کا ذکر حضرت مرتب نے اپنے خط میں کیا ہے تاہم اس کی اہمیت
اور صحتِ کتابت کے پیشِ نظر میں نے اسی نسخہ کو بنیاد بنا کر ایک پاک و صاف، صحیح و درست نسخہ ترتیب
کرنے میں دوسرے تمام حاصل کردہ نسخوں سے مدد لی ہے اور ہر نسخہ کا اختلاف حاشیہ میں لکھ دیا ہے۔
مختلف کتب خانوں سے حاصل کیے ہوئے نسخہ جات میں تین نسخے نامکمل، کرم خوردہ اور بدخط ہیں۔ نہی
نامکمل نسخوں میں ایک نسخہ نہایت قدیم و کارآمد ثابت ہوا جو کبھی علیم الدین تاجر کتب حیدرآباد کی ملکیت تھا۔
اب کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد کی زینت ہے لیکن اس نسخے میں سے درمیانی چند اوراق غائب ہیں
اور ترتیب میں بھی خاصا فرق ہے چونکہ اس کا دیباچہ اس کے مرتب اول کا لکھا ہوا ہے اس لیے اسے میں نے

ئے اصل دیوان کو

نسخہ نمبر ۲ قرار دیا ہے۔ نسخہ نمبر ۳، آصفیہ لائبریری کا وہ نسخہ ٹھہرا جسے نصیر الدین ہاشمی نے قدیم قبل از ۹۷۳ھ بتایا ہے جس کا حوالہ تصوف ۲۱۸ اور جس کے صفحات کی تعداد ۱۱۸ ہے اس نسخہ کے ہر صفحہ پر سطروں کی تعداد مختلف ہے۔ کسی صفحہ پر ۹ سطریں تو کسی پر دس، گیارہ اور بارہ تک ہیں۔ چوتھا نسخہ کتب خانہ سالار جنگ کا ہے یہ کبھی فتحمند خان کی ملکیت رہا تھا اس کے سرورق پر یہ مہر لگی ہوئی ہے کاتب نہایت خوش خط ہے اسے خط نسخ کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ پانچواں بھی سالار جنگ کے کتب خانے ہی کے نسخے کو قرار دیا گیا ہے یہ مکمل اور بہتر حالت میں ہے۔ چھٹا نسخہ کتب خانہ آصفیہ کے خط نستعلیق میں موجود نسخے کو قرار دیا ہے ان تمام نسخوں میں یہ واحد نسخہ ہے جو خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ اس کا سن کتابت ۱۰۹۵ھ اور حوالہ ۱۶۶۹ ہے۔ کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد کے دونوں نسخے ناقص الاول و اوسط ہیں۔ دونوں ہی نسخوں کے درمیان اور ابتدا میں کئی صفحات غائب ہیں تاہم ان نسخوں کے حواشی پر بعض مفید و اہم معلومات درج ہیں جس کی وجہ سے ان کی اہمیت بڑھ گئی ہے انہیں سے ایک نسخہ ۱۰۹۱ھ کا کتابت شدہ ہے جس کا حوالہ ۱۹۰۲ اور دوسرا جس کے اوراق ضائع ہو جانے کے باعث سن کتابت معلوم نہ ہو سکا حوالہ ۱۹۰۵ ہے۔ یہ دونوں نسخے نہایت خوش خط روشن اور غلطیوں سے پاک ہیں لیکن نامکمل ہیں۔
میں نے چونکہ اپنے متن کی بنیاد حضرت سجادہ صاحب روضہ گاد ل حسن قدس سرہٗ کے مملوکہ نسخہ پر رکھی ہے کہ یہ نسخہ اول تو صاحب سجادہ کا مرتب کردہ بلکہ صاف کردہ ہے اگرچہ کہیں کہیں الفاظ زاید اور لفظ میں لفظ کو ملا جوڑ کر کتابت کیا گیا ہے لیکن تھوڑی کوشش سے بہ آسانی پڑھا و سمجھا جا سکتا ہے اور دوم یہ کہ اس کی ترتیب کے وقت صاحب جواہر اسرار اللہ کے تحریر کردہ نسخہ کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اس لیے یہ زیادہ مستند صحیح نسخہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کی ترتیب میں وہی التزام ہے جو دوسرے تمام نسخوں کی ترتیب کے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں اس میں بھی الفاظ چھوٹ گئے ہیں اور ایک صفحہ پوری طرح غائب ہے۔

زبان

جواہر اسرار اللہ کی زبان گجراتی آمیز، فارسی، عربی، ہندی کا رلا ملا لسانی گلدستہ ہے ہندی کا اثر نمایاں ہے اس کا اسلوب وہی ہے جو دکنی اور کھڑی بولی کی بنیاد ہے اس اعتبار سے حضرت قدس سرہٗ کی زبان آپ بھی لسانی روایت سے قریب تر کہی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا بیان ہے؛

"شاہ صاحب کی زبان واضح طور پر (آ) بنیاد رکھنے والی بولی
سے تعلق رکھتی ہے۔ زبان دہلوی اور زبانِ دکنی کے درمیان کی
یہ کڑی اس تسلسل کی نشاندہی کرتی ہے۔" [۱]

جواہر اسرار اللہ کے دونوں مرتبین اور بعد میں شیخ عبدالرحمان العمودیؒ، حضرت قدس سرہٗ کی زبان کو گجری کہتے ہیں۔ غالباً اُردو زبان کے لیے یہ اصطلاح "سب سے پہلے مرتبہ استعمال ہوئی ہے"[۲] لیکن بقول ڈاکٹر مسعود حسین خاں

"لسانی نقطۂ نظر سے اس کا گجراتی زبان سے کوئی تعلق نہیں"[۳]

مگر سید ظہیر الدین مدنی کہتے ہیں:

"درحقیقت گجری نام گجرات کی مناسبت سے دیا گیا ہے اور
یہی زیادہ قرینِ قیاس ہے" [۴]

حضرت برہان الدین جانم کے یہاں بھی "گجری" زبان ہی کے نام کے ضمن میں استعمال ہوا ہے[۵]

جسے ہوں گیان بچاری   نہ دیکھیں بھاکا گجری گجاری   (حجۃ البقا)

ڈاکٹر حسینی شاہد لکھتے ہیں۔

"اُردو زبان کی وہ شاخ جو گجرات پہنچی گجری کہلانے لگی"[۵]

---

۱ علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۳۳

۲ مقالاتِ شیرانی جلد اول ص ۱۸۳

۳ علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۳۳

۴ سخنورانِ گجرات ص ۲۹

۵ سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے ص ۱۸۲

"اور ان معنوں میں یہاں "گوجری" سے مراد مسلمانانِ گجرات کی زبان ہے"۱؎

اس میں کوئی شک نہیں کہ جواہر اسرار اللہ میں گجراتی زبان کے کثیر الفاظ قدرے رد و بدل اور کہیں من و عن اپنی اصل شکل صورت میں اپنے پورے صوتی آہنگ کے ساتھ موجود ہیں لیکن ہم اسے ابتدائی دور کی اردو کا وہ نمونہ ہی قرار دیں گے جو علاقہ گجرات میں پروان چڑھ رہی تھی اور

"جواہر اسرار اللہ کی ترتیب کے زمانے میں اس زبان کے لیے گجری کا نام رائج ہو گیا تھا۔" ۲؎

وہ اشعار جن پر گجراتی زبان کا اثر واضح اور نمایاں ہے

حیب پرم اپنی چیت دھروں　　آلیس دکھاوں من حسد کروں
یوں آپ کہ گھونگھٹ کردں　　رے بھائیو ہوں سُوں کروں

شاہ علی جیو پیو پچھانوں　　علی محمد دوئی نجانوں
ایک وجود ہے من یوں آنوں

تو چھپند کہایا پائن جفاں　　شاہ علی محمد منج میناں
سو سنیاں سہیو کان کناں

ان نینوں ماہیں تیج وہی　　اس تیتی ہیرن سیج وہی
یہ چولا چوسر سیج وہی

۱؎ مقالاتِ شیرانی جلد اول ص ۱۸۳

۲؎ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے ص ۱۸۳

لیکن جب ہماری نظر جواہر اسرار اللہ کے ان شعروں پر پڑتی ہے

ڈھونڈن نکلی پیو کوں لگ گئی جو کھوے   جیدھر دیکھوں ایک ہو ل منج بن ہو نر کوے

ہُوں اک دیکھوں اپنچ چاکھوں تمھیں کہو دو تین

تمھیں تمھارا دین ہو بھا یو ھموں ہمارا دین

تو اس کی بے ساختگی پر دل جھوم جھوم جاتا ہے اور ہمیں اک ایسی ملی جلی زبان جو دندھیا آچل کے اس پار کے لسانی اثرات کو ذائل کر کے کھڑی بولی کی ترقی پذیر ہیئت وصورت میں ہمارے کانوں کی جنت بھاتی معلوم ہوتی ہے۔ مختلف زبانوں کے میل ملاپ کا ایسا ذخیرہ کسی اور جگہ اسقدر کثرت سے دیکھنے کو نہیں ملتا جسقدر کہ یہاں ہے۔ اک ندی ہے کہ ندرسے مختلف خطّوں اور زمینوں کی تاثیر لیے چٹانوں اور ریگزاروں سے پھسل پھسل کر صاف وشفاف محل ومیدان میں بہتی ہوئی نا معلوم سمت وراہ کی طرف رواں ہو جسمیں فطری مٹھاس گھل مل کر ہر تشنہ لب کو سیراب اور ہر جاں بہ لب کو حیات بخشتی جائے مختلف زبانوں سے ملا جلا صوتیاتی ڈھب کس قدر مانوس ہوجاتا ہے ملاحظہ ہو:

ع   چھوڑ دو لوگا لوج لڑائی کان کر دیہ پریم کھائیں

پھر پھر دہی اک سبد سنائے   دوکی لوک اواجی لائے

نہ بولو بول کچھ کاچو   جو لاگی پیار تم سا جو   تمن بھی ایوکھیں ناچو   [ضمیر تم سے تمن]

جمع بنانے کا قاعدہ: جی کو جیسی بات پریئے تس سوں تیسی باتاں کیجے   [بات سے باتاں]

برج بھاشا سے نمایاں اثر: جب مکہ سوں آکھے ایویں پاس ہمارے کوئی نہ آیو   آیو، لایو

ہور دو ہاتھوں ھنس ھنس تانیں جات گلے تب تسکوں لایو

پنجابی کا شعر: پر کٹیا سیری سیریاں میں باتاں پوچھیا سیریاں

اُردوے قدیم کے بے شمار الفاظ اپنی شکل و صورت میں کثرت سے استعمال ہوے ہیں۔ مثلاً سوں، بسیتیں، تسکوں، سوایا، ہور، داری جاؤں، نرمائی (نرمی) "چ" تاکیدی مثلاً یو نہیچ تو نیچ، ہیچ، سے جواہر اسرار اللہ کا ورق ورق شاداب ہے۔

جواہر اسرار اللہ کے نظموں کی ہیئت

ہندوستان میں تصوفِ اسلامی اور صوفیاے کرام علیہ الرحمۃ کے تصورات و پیام کی مقبولیت اور ان کی ہر دل عزیزی کی بڑی وجہ یہاں کا پہلے سے تیار متصوفانہ ماحول تھا۔ عوام میں بھگتی کے گیت اور خدا سے محبت کے کئی طریقے رائج تھے کبھی اس کا اظہار موسیقی کے لحن و آہنگ سے ہوتا تو کبھی رقص و گیت سے لوگ اپنی روحانی تسکین اور قلب کی یکسوئی کرتے حقیقتاً یہ ایک طرح سے ان کا طریقہ عبادت تھا[1] لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے اور اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں کہ لوگ عام طور پر ایک طرف ہر نقصان رساں ہستی سے خوفزدہ و سہم کر اس کی پرستش کرتے اور حالتِ خوف و مصیبت میں اس سے مدد چاہتے تو دوسری طرف اُپنشدوں کی تعلیم کے باعث خدا، بندہ اور اشیا کے رشتوں سے بھی واقف تھے[2] ہستیِ فانی اور ہستیِ لافانی کی پرستش کا یہ دو رُخا اندازِ عبادت ایک طرف خداے لاشریک کے وجود اور دوسری طرف عقل و شرفِ انسانی کی توہین تھا۔ نویں صدی عیسوی؁ تیسری صدی ہجری میں شنکر اچاریہ نے جب "اہم برہما" (بندہ خدا ہے) کا تصور پیش کیا تو عوام میں تصورِ الٰہ کو اک نئی جہت ملی لیکن تزکیۂ نفس اور تصفیہ باطن کے ادھورے پن کی وجہ سے فکر و شعور عقل و فہم رکھنے والا ایک طبقہ ہنوز غیر مطمئن و گم کردہ راہ تھا۔ جب صوفیاے کرام یہاں پہنچے اور تصورِ وحدت الوجود کو ذی علم و یقین اصحاب اور اہلِ بصیرت و دانش مند

[1] رقص سے گھنگھروں، پیروں اور ہاتھ کی انگلیوں سے رمز و اشارات سمجھائی جاتی اور موسیقی سے روح کی چھپی ہوئی تڑپ کی تسکین کی جاتی ہے

[2] پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں لکھا ہے "The Upanishads are instinct with a sprit of inquiry, of mental adventure, of a passion for finding out the truth about things." - page 64.

ارباب کے سامنے پیش کیا تو اسے قبول کرنے میں انھیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ ان صاحبِ دل بزرگوں اور برگزیدۂ عالم ہستیوں نے نہایت آسان لفظوں، تمثیلوں اور دل میں گھر کر جانے والی باتوں سے کچھ اس طرح تصورِ الٰہ پیش کیا کہ عوام جوق در جوق راہِ صواب کی تلاش میں ان صوفیائے کرام کے آستانوں تک آ پہنچے اور یہاں کی رحمتوں و نعمتوں سے بھری فضا میں تسکین و اطمینان کا سانس لے کر عرصۂ دراز تک ان کا دامنِ فیض تھامے رکھا۔ ان اصفیائے زمانہ کے آستانوں کی جبہ سائی سے ان تشنہ کامانِ دہن کو جب مئے وحدت کے دو گھونٹ[۱] مل گئے تو نشۂ عرفان کی بیخودی و سرشاری نے کمالِ الفت انھیں رقص کناں رکھا اور جب یہ صاحبِ حال ہو کر یہاں سے اٹھے تو شانِ رحمت کا چہرہ نکلتے۔ انہی کے دم قدم کی بدولت نہ صرف خواص بلکہ عوام کا اک بڑا حلقہ متاثر ہو کر ان کی پناہ میں آ گیا جہاں وہ صلح کل اور پریم مارگی تحریک کے روپ میں صوفیانہ مسلک کی ترویج و اشاعت کرتے رہے۔

ہندوستان میں صوفیائے کرام نے اسلام کی اشاعت کے ضمن میں "عشق اللہ" کی اہمیت پہ زیادہ زور دیا وہ قرآن مجید کی اس آیت وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہ پر زور دیتے تھے اور خود اسی کی گویا چلتی پھرتی تصویر تھے۔

حدیثِ قدسی میں ہے لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاك[۲] کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہی کی وجہ سے خدائے تعالیٰ نے اٹھارہ ہزار عالم پیدا کر کے ہماری اس دنیا کو صرف سرکارِ دو عالم صلعم کی وجہ سے پسند کیا کہ ہماری یہ دنیا اپنے ہونے میں عشق سے عبارت ہے اور شاید اسی لیے یہ حکم ہوا کہ دنیا کو برا مت کہو کہ یہ اللہ کی محبت سے ہے۔ شیخ اکبر[۳] رضی اللہ عنہ نے اسی لیے اسلام کو مذہبِ عشق قرار دیا ہے۔ صوفیائے کرام کا قول العشق هو الذات، ایک دعویٰ ہے اور اس کی دلیل حضور

۱ دو گھونٹ سے مراد لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ
۲ بخاری و مسلم
۳ اذا تم الفقر فهو الله

آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے قول مبارک المحبۃُ الّتی ھی اصل الوجودؔ پر قائم ہے۔

حضرت سیدی شاہ علی جیوگاؤں دھنی قدس سرہٗ کا کلام تصورِ وحدت الوجود کی رنعت وعظمت سے مزین، لحن و آہنگ سے پُر، موسیقیت ریز الفاظ کے انتخاب سے سجا سجایا آراستہ، لَے کے نہ ٹوٹنے والے سرگم سے بندھا ٹکا نظر آتا ہے۔ کسی شعر کو پڑھ جایئے تسجیع وسُبھاؤ کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہوا معلوم ہوگا۔ حضرت نے شاعری میں بھی انفرادیت کی وہی شان اور وہی خصوصی سج دھج قائم رکھی جیسی کچھ اصفیائے گجرات وہند میں خود آپ کی تھی۔ بادی النظر میں آپ کا کلام حضرت شیخ بہاؤالدین باجن کے کلام سے ملتا جلتا نظر آتا ہے۔ ہیئت شعری صاف کہے دیتی ہے کہ "وہ جکری" سے الگ کوئی صنف نہیں ہے لیکن باجن کے یہاں جکری طوالتِ بیان کے باعث مربوط نظم کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ شعروں میں روانی، برجستگی اور سوز وگداز کا بھی وہ معیار قائم نہ رہ سکا جو حضرت شاہ علی جیوگاؤں دھنی قدس سرہٗ کے یہاں ملتا ہے۔ شیخ باجن کا کلام ایسی کوئی کیفیت پیدا نہیں کرتا جسے ہم "سیردگی" کا نام دے سکیں۔ برخلاف اس کے حضرت شاہ علی جیوگاؤں دھنی اپنی بات ٹھہر ٹھہر کر کچھ اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ نغمگی اور رسیلے پن کا تار کہیں بھی ٹوٹنے نہیں پاتا۔ حضرت قدس سرہٗ نے فطری سادگی، کیف آور روحانی تسکین اور مترنم لب ولہجے سے وحدت الوجود کے ادق ترمسائل کو شعری جامہ پہنا کر ایجاز واختصار سے وہ کام نکالا ہے جس سے تاحال اُردو کی متصوفانہ شاعری کا دامن خالی نظر آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے کلام میں عربی زبان کا فطری حُسن، وسعت وگہرائی؛ فارسی کا رعب ودبدبہ، سنسکرت کی دیوبانی، گجراتی کی بے ساختگی، ہندی کا بانکپن، پنجابی کی گھن گرج ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے قدم سے قدم ملائے چلتے نظر آتے ہیں۔ فطری رچاؤ اور دل موہ لینے والی اسی خوبی کے باعث حضرت قدس سرہٗ نے

ے وجود کی اصل محبت ہے

نے اپنے کلام کو مکاشفہ کا نام دیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں :

"ہر نظم کو مکاشفہ کہا گیا ہے۔ ہر نظم کئی بندوں پر مشتمل ہے۔
اور ہر بند کو نکتہ کہا گیا ہے۔ شیخ باجن نے اپنے گیت یا نظم کو
عقدہ کا نام دیا تھا۔ ہر بند کو بین کہا تھا اور آخر بند کو تخلص کا نام
دیا تھا۔ ہئیت دونوں کے ہاں ایک ہے"۔ لہ

اظہارِ عشق و محبت، ذکرِ ہجر و وصال، وارداتِ قلب و جگر اور مسائلِ تصوف و تفکر کے بیان کے لیے "جکری" سے بہتر صنف اور کون ہو سکتی تھی۔ اس میں تڑپتا ہوا دل اور تڑپا دینے والی کیفیت بھی ہے تسکینِ قلب و نظر بھی ہے جل رُبائی و دلآسائی بھی ہے اس صنف کی ایسی ہمہ گیر وسعت کے باعث اسے غزل کا کوتاہ قد نقش (Miniature) کہا جا سکتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ بطن غزل ہی سے نمودار ہوئی ہے اس کے اوصاف، صاف کہے دیتے ہیں کہ وہ غزل ہی کی نوزائیدہ ہے۔ اس میں غزل ہی کا بانکپن اور اسی کا انداز اور اسی طرز روش کے جوہر پائے جاتے ہیں، محبت کے ماروں کی ترجمانی کا حق اس صنف سے بہتر کسی اور صنف سے ممکن نہیں۔ یہ جب رس گھولنے والے سُروں کی سنگت میں گائی جاتی ہے تو جگر پھٹ جاتے ہیں اور سانس رک رک کر چلتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے۔ حضرت بہاؤالدین باجن رح ایک مقام پر جکری کی تعریف میں یہ دو جملے سپردِ قلم فرماتے ہیں :

" در ذکر اشعار کہ مقولہ این فقیر است بزبانِ ہندی "جکری"
خوانند و قوالانِ ہند آں را در پردہا و سرود می نوازند"۔ [۲]

قاضی محمود دریائی قدس سرہ نے بھی جکریوں کا ایک قابلِ قدر مجموعہ اپنے عقب میں چھوڑا ہے۔

لہ تاریخ ادب اردو جلد اول صفحہ ۱۱۵

[۲] بحوالہ لکھنوی ان گجرات صفحہ

قاضی صاحب کی حکبریوں میں خیال آفرینی کا حسن پورے شباب پر نظر آتا ہے۔ انہی کے ہاں اول اول حسن و عشق کے موضوع نے اس صنف میں جادوگری کی ہے اور یہیں پر محافلِ سماع میں مقبولیت کا تاج اپنے سر پر رکھ کر سرشتگی کا حق ادا کیا اور شعر و سخن کی حکمرانی کا سکہ ہر طرف جاری کروایا۔

مترجمینِ اخبار الاخیار نے قاضی محمودؒ کی حکبریوں کے ضمن میں عبدالحق محدث دہلوی کے اس مختصر بیان

"حکری ہائے ولے کہ بزبان ہندی دارد، دستورِ قوالاں آں
دیار است بغایت مطبوع و موثر و بے تکلف و آثارِ عشق و وجد
از سخنانِ ولے لائح است۔"

کی یوں ترجمانی کی ہے:

ہندی زبان میں آپ کی بہت سی کافیاں لکھی ہیں جو اس
علاقے کے نعت خواں اکثر پڑھتے رہتے ہیں۔ یہ کافیاں لوگوں
میں بے انتہا مقبول ہیں۔ موثر ہونے کے علاوہ بڑی بے تکلفانہ
انداز اور زبان میں ہیں۔ آپ کے تمام کلام میں عشق بھرا ہوا ہے۔"[۱]

حضرت سیدی شاہ علی جیوگاڈں دھنی قدس سرہٗ کے یہاں، حضرت قاضی محمود دریائیؒ رحمۃ کا ہی مزاجِ شعری ملتا ہے۔ انہی کے یہاں یہ اپنے عروج و کمال کی انتہا پر پہنچ کر اپنے ہمعصر شعراء و مستفیضین و عرفا سے عرصہ دراز تک خراجِ تحسین وصول کرتا اور درس و تدریس کی محفلوں کی زینت بنتا رہا۔ حضرت سیدی فاضل بیاباں قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں:

"حضرت شیخن احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ رفتہ سعادت حاصل کردم،
دورانِ وقتِ عمرِ من عالی چہاردہ، پانزدہ سالہ بود، والمختصر

۱؎ اخبار الاخیار (اردو) مولانا سبحان محمود [illegible] و مولانا محمد فاضل صاحب دارالعلوم [illegible] مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی۔ ص [illegible]

بعد نصف شب درسِ حقایق فرمودے ۔ مثنوی و فصوص و
لمعات و دیوانِ سید علی کاوں دھنی رح را بیان فرمودے
و سوائے مردم تدرس و خادمِ خاص، دیگر از اجنبی را اجازت
نہ بود"۔ لہ

(دو نواری)

حضرت سیدی شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کے یہاں ہئیتِ شعری اور موضوع کی بوقلمونی تخیل کا جادو جگاتی نظر آتی ہیں۔ ہندی گیتوں کا سوز و گداز اور فارسی غزل کی گہرائی و گیرائی ان کے مکاشفات میں کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ان کے موضوعاتِ علمی میں وحدت الوجود و نظریہ ہمہ اوست کے علاوہ نعتِ رسولِ محتشم صلی اللہ علیہ وسلم مدح صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالے علیہم اجمعین و مناقبِ سیدنا احمد کبیر رضی اللہ عنہ قابلِ ذکر ہیں جنھیں تحریر کرتے ہوئے ادب و احترام کے کسی پہلو کو آپ نے ترک نہیں فرمایا۔ مسائلِ فقہ کو جس خوبی و خوش اسلوبی سے نظم کا جامہ پہنایا ہے کہ یہ آپ ہی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ کی فقہی و عالمانہ نظر بڑی گہری تھی۔ درسِ حقایق و تدریسِ دقایق میں آپ کا قلم معلمانہ صفت کا حامل ہو جاتا ہے مگر تحریر کی جاذبیت اثر پذیری میں سچ کوئی فرق نہیں آنے پاتا اور بیک وقت یہ جہاں اساتذہ کے معیار پر کھرا اترتا وہیں تلامذہ کے ادراک و فہم کے بھی عین مطابق ہوتا۔ اردو زبان کے متصوفانہ ذخیرۂ شعر میں تخیل کی ایسی بلندی بیان کا ایسا زور، زبان کی ایسی حلاوت، مضامین کی اسقدر فراوانی، الفاظ کی ایسی برجستگی ایجاز و اختصار کا ایسا انداز اس کی اشاعت کے عرصہ بعد تک کہیں پیدا نہ ہو سکا۔ سچ تو یہ ہے کہ تصوف کی شان و شوکت اور اس کا جاہ و جلال دیکھنا ہو تو جواہرِ اسرار اللہ کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔

لہ یدِ بیضا صفحہ ۱۰۲ مطبوعہ ۱۹۱۰ء حیدرآباد۔

جواہرِ اسرار اللہ کی ایک صنف "سی حرفی"

فارسی کی بعض مشہور مثنویوں، بے سرنامہ، خیاط نامہ، الٰہی نامہ کی طرز پر صوفیائے کرام نے دین و اخلاق کی باتوں کی فہمائش و یادداشت کے لیے اُردو میں "سی حرفی" یا "الف نامہ" تحریر کیا۔ ابتداً غالباً یہ تفریح و تفنن کے لیے فی البدیہہ کہا گیا ہوگا بعد میں اس کی زود اثری اور دلچسپ روش کے باعث ضبطِ تحریر کیا جانے لگا ہو۔ ایران سے جب صوفیا اور شعرا کی ایک بڑی جماعت تعداد ہندوستان آئی تو اپنے ساتھ اصنافِ شعر کی دولت بھی لیتے پہنچی اور جب ضرورت درپیش ہوئی تو اسے یہاں سب میں بانٹ دیا۔ یہی طرزِ روش اردو میں الف نامہ یا سی حرفی کے ایجاد کا باعث بنی۔ اس صنفِ شعر کی خوبی سے متاثر ہو کر یہاں کے فقیر منش، سادھو سنت اپنی اپنی بولیوں میں اس کا تجربہ کیا۔ ڈاکٹر شکنتلا دوبے کا بیان ہے۔

> "بالعموم سنتوں میں اس قسم کی ہیئتِ شعری کا رواج فارسی اثرات
> ہی کا پتہ دیتا ہے۔ چونکہ فارسی کے الف ناموں کا کافی رواج
> رہا ہے اس لیے یہ کہنے میں ہمیں باک نہیں کہ سنتوں نے ککھرا
> ترتیب دینے میں 'الف نامے' ہی سے استفادہ کیا ہے"۔[1]

لیکن اول اول یہ "بارہ کھڑی" کے نام سے اور بعد میں اک علاحدہ صنفِ شعر کے طور پر "ککھرا" (ककहरा) مشہور ہوا۔ کیوں کہ اس میں الف با تا کی طرح क ، ख ، ग حرف سے شروع کرنے کی سچ و پیچ موجود ہے جبکہ بارہ کھڑی اس مفہوم کی ادائگی سے قاصر ہے۔

کبیر داس کے یہاں اس ہیئتِ شعری کا چلن قدرے متوازن معلوم ہوتا ہے جو کہ ان کے صوفیانہ مزاج کی دین ہے۔ سکھ مت کے شاعروں، سنتوں اور گروؤں نے بھی اس میں طبع آزمائی کی اور

[1] کاویہ روپوں کے مول سروت اور ان کا وکاس ص ۳۰۹ بحوالہ ہندی اور گجراتی بھگتی کال پر اسلامی ثقافت کے اثرات ص ۸۹

نہایت اچھے الف نامے یا گکھرے تحریر کیے۔ ان میں دھرنی داس کا الف نامہ عوام میں بے حد مقبول
ہوا۔ پنجاب کے شعرا میں باری صاحب اور بھیکھا صاحب نے اس فن کو بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا۔ بھیکھا صاحب
کے الف نامے کا یہ مقطع الف نامے کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے ؎

تین آنک میں وستو سکل ہے رچ تم سم ائیں
بھیکھا نام سن جب دیکھو تب بھیو اچھر تیس

ہندوستان کی کم و بیش سبھی زبانوں میں سی حرفی کا اثر پڑا ہے اور الف نامے لکھے گئے
شعرا نے اس میں مذہب کی اچھی اچھی باتوں کو پیش کیا۔ گیت بھجن اور سبق آموز اخلاقی
قصے بیان کیے۔

اردو شاعری میں بھی فارسی ادب کے اثر اور کچھ علاقائی و مقامی تہذیب و سماجی ضرورتوں کے
پیشِ نظر بعض اصنافِ شعری کو رواج ہوا۔ انھی میں سے ایک سی حرفی بھی ہے۔ یہ الف نامہ بھی
کہلاتی ہے۔ سی حرفی یا الف نامہ دراصل حروفِ تہجی کے تیس حرفوں پر مشتمل مربوط نظم کا نام ہے
جس کے ہر حرف سے کوئی اخلاقی بات یا کوئی علمی نکتہ بیان کیا جاتا ہے اور حرفِ مذکور
ہی لکھنے کا سرنامہ ہوتا ہے جیسے بچوں کے لیے لکھے گئے الف نامے کا یہ پہلا شعر

الف سے اللہ کو پہچانو ب سے بسم اللہ کہو

حضرت سیدی شاہ علی جیوگاؤں دھنی قدس سرہٗ نے جو سی حرفی تحریر فرمائی ہے وہ یکسر روح
کی صدائے دردِ اول معلوم ہوتی ہے۔ کیا بلحاظِ تخیل اور کیا بلحاظ فن بے اپنی مثال آپ ہے۔
اس کا ہر شعر معرفت کے ادب کا اک مکمل باب معلوم ہوتا ہے اس کے ہر حرف سے قرآنِ حکیم
کے تیس پاروں میں بیان کیے گئے اسرار کو کھولا گیا ہے اردو زبان میں اس انداز کی ایسی جامع اور

پُرمغز سی حرفی سوائے حضرت قدس سرہٗ کے کسی نے بھی نہیں لکھی اور اُردو ادب میں "اس کی اولیت کا سہرا اِن ہی کے سر بندھتا ہے"۔۱؎ مگر پروفیسر محمود شیرانی لکھتے ہیں :

"بارہ ماسے اور سی حرفیاں پنجابی ادب کی خصوصی شاخ ہیں جو
اب بالکل متروک ہیں۔ سی حرفی گجراتی اُردو میں بھی ملتی ہے اور شاہ
علی جیو گام دھنی رحؒ کے جواہر اسرار اللہ میں موجود ہے "۔۲؎

اُردو زبان، چونکہ سماج میں ہونے والی ہر تبدیلی کا اثر جلد جلد قبول کر رہی تھی اور اس میں ہر نئی بات کو سمو لینے اور اسے اپنا کر اک نیا روپ دینے کی پوری صلاحیت پیدا ہو رہی تھی اس لیے ملک کی کئی زبانوں میں مروج اصنافِ ادب سے اس نے بھرپور استفادہ کیا۔ پروفیسر محمود شیرانی کا بیان ہے۔

"چونکہ پنجاب میں اب تک یہ صنف رائج ہے اس لیے میں
اس کی تشریح سے اعراض کرتا ہوں۔ بارہ ماسہ کی طرح سی حرفی
بھی ہندی کی ایک پرانی شاخ ہے"۔۳؎

جسے اپنا کر اُردو زبان نے اُس دور کے ناخواندہ عمر کو پہنچے ہوئے افراد میں علم حاصل کرنے کا شوق پیدا کیا اور ہر وہ اخلاقی و تنظیمی بات جسے ذہن کے تہوں تک پہنچانا مقصود ہوتا شعرا اسی صنف سے کام لیتے۔ پنجاب میں اس صنف کے زیادہ مقبول ہونے کی بڑی وجہ وہاں کے لوگوں کی غیر جدت آمیز تقلید اور فطری طور پر انہیں بھی نقالی کا کامل جذبہ موجود تھا اس لیے یہ صنف وہاں زیادہ مقبول ہوئی۔ سی حرفیاں مختلف ہیئتوں میں لکھی گئیں۔ مربوط و مسلسل نظم کی شکل میں بھی اور ترجیع بند اور ترکیب بند کی ہئیت میں بھی۔ طویل سی حرفیاں، بند، مربع، مخمس یا مسدس کی ہئیت میں بھی ہو سکتی ہیں ان کا ڈھب زبان میں موجود حروف کی تعداد پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر

۱؎ ... علی گڑھ تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۱۱
۲؎ پنجاب میں اردو صفحہ ۵۵
۳؎ مقالاتِ شیرانی جلد اول صفحہ ۱۸۶

گیان چند جین نے لکھا ہے:

"اُردو رسم الخط میں ہکاری حروف کو چھوڑ کر ۳۵ حرف ہیں یعنی عربی کے ۲۸ فارسی کے مخصوص ۴ یعنے پ چ ژ گ اور ہندی کے تین ٹ، ڈ، ڑ۔ ان میں سے ڑ سے کوئی حرف شروع نہیں ہوتا اس طرح اُردو میں زیادہ سے زیادہ ۳۴ حروف کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سی حرفیاں ۲۸ سے ۳۴ حروف تک کی ملتی ہیں۔"

سی حرفی دراصل درس وتدریس کے طریقے کو آسان بنانے اور بعض علمی نکات کے ذہن نشین کرانے کی غرض سے لکھی جاتی تھی۔ مبتدیوں کی تعلیم اور انکی ذہنی تربیت کے لیے محدود تعلیمی وسائل کے اس دور میں اس سے بہتر کوئی اور طریقہ ارباب علم ودانش کے پاس نہ تھا اس صنعت کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ عام بول چال کی زبان میں لکھی جاتی اس کا عام مقصد جو فائدہ کثیرہ سے خالی نہ تھا یہ تھا کہ کند ذہن، غبی وعالم بے زار افراد کے لیے یہ نظم عجیب وغریب، سریع التاثیر اور دل میں گھر کر جانے والی طلسمی شئے کے شکل تھی۔ اس کے رواں انداز اور مانوس ہیئت ترکیبی سے ادق تر مضمون بھی جلد ازبر ہو جاتا اور نکاتِ علمیہ بڑی آسانی سے دل میں اُتر جاتے۔

شاعری مذہب نہیں لیکن اچھا شعر مذہب ہوتا ہے خواہ وہ پندونصائح کی صورت میں ہو کہ فلسفۂ توحید کی شکل میں یا حسن وعشق کے ذکر میں ہو کہ مناظر فطرت کے بیان میں آدمی جب کسی شعر کو سن کر یا پڑھ کر اسے اپنی حیات کا حاصل وسرمایہ بنا لیتا ہے تو یہی شعر اس کے ایقان وعقیدے کا مظہر بن کر اس سے خراج بھی وصول کر لیتا ہے۔ فطرت شناس طبیعت اس سے

بھی مناسب و موزوں موقع پر کام لے کر ماحول پر جادوگری اور اپنی بات میں وزن پیدا کر لیتی ہے اظہار کی سلیقہ مندی و اثرانگیزی شاعر کے قادرالکلام ہونے کا کھلا ثبوت ہے کبھی کبھی تاثیری خوبیوں سے مزین زبان سے نکلا ہوا شعر، خباثتِ نفس و سفاہتِ روح کی اصلاح کا کام کر جاتا ہے۔ شاعری دل کی بات ہے اور یہ دل ہی کو تھام لیتی ہے۔ صوفیائے کرام نے اس حقیقت کو اپنی ذاتِ عالیہ و تدبر شخصی سے جانا اور اس سے وہ وہ کام لیے جو کسی اور فن سے ممکن نہ تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے:

"جسے عوام تک پہنچانا ہوتا وہ اسی زبان کو ذریعۂ اظہار بناتا۔ اسی لیے صوفیائے کرام نے تبلیغ دین کے لیے اسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا اور اسے ادبی سطح پر لانے میں اک اہم کردار ادا کیا۔ انھیں صوفیا کے ملفوظات اور شاعری اس زبان کے قدیم ترین نمونے بن کر آج بھی تاریخی و لسانی اہمیت رکھتے ہیں جن میں بھگتی تحریک کی شاعری کے علاوہ جن بھی شامل ہیں۔" ؎

"سی حرفی" قدیم تدریسی طریقۂ تعلیم ہے۔ اس سے ہر وہ بات کہ جب وہ سننے والے کے مزاج اور مذاق سے ہم آہنگ ہو تو وہ تادیر اپنے سننے والے کو متوجہ رکھتی ہے۔ ابتداً شاید ایسے شعر بطور مثال و تجربہ، فی البدیہہ کہہ کر ذہن نشین کرائے جاتے رہے ہوں گے پھر باقاعدہ اس کی اثر پذیری کو دیکھ کر طویل طرز کی نظمیں تلمبند کی گئی ہوں گی اور پھر اک مستقل صنف کی شکل اختیار کر کے ادب کا ماخذ و حصہ بن گئی ہوگی کیوں کہ یہ عموماً ایسے ماحول اور ایسے حالات میں وجود پذیر ہوتی ہے جہاں لوگ سخت محنت تو کرتے ہوں لیکن علم سے بے بہرہ و نابلد ہوں اور نازک خیالی و اخلاقی باتیں ان کے پلے نہ پڑتی ہو۔ دراصل یہ صنف Adult Education کا ایک قدیم تعلیمی تجربہ تھا جو اس زمانے کے ناخواندہ بالغ ذہن کو پیش نظر

؎ تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۱۴

رکھ کر الف نامہ کی صورت میں مرتب کیا گیا تھا۔ سی حرفی میں ایک خوبی یہ ہے کہ یہ کامل انسان کی طرح اپنے تاثر و کمال کے بل بوتے پر آگے بڑھتی اور اپنی پوری قوت سے سامع پر اثر ڈالتی ہے۔ سیدی شاہ علی جیو گاواں دھنی نے اس کی اس خوبی سے خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے اور قرآنِ حکیم کے تیس پاروں کی گویا تفسیر کر ڈالی ہے اس کے ابتدائی دو شعر بطور تمہید بیان کر کے اپنی "سی حرفی" کے متن کا خلاصہ کر دیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ساری کائنات جس کے دستِ قدرت کی یہ مرہون ہے وہ خود ہی اس کائنات کا عین ہے کہ سارا جہاں نقطے میں پریشان ہے فی الواقع "ع" اور "غ" میں ہیئت کے اعتبار سے کچھ فرق ہے ہی نہیں اُس نے اپنے جمال کے دیکھنے کے لیے ہی تو ایسا روپ بدلا ہے۔ اور دونوں "عین و غین" ظاہر کر کے خود اپنے جمال کا آپ مشاہدہ کر رہا ہے۔ ملاحظہ ہو:

عین گسائیں غین کہایا   ناؤں کا آپیں ٹمکا دیتا

آپیں آپس سیتیں سائیں   غمزے تائیں نکتا کیتا

سی حرفی کی ابتدا اس طرح کی ہے:

ایک الف، ب، ت ہو آیا   ولی سو "ث" ہو آپ بچایا

"الف"، ذاتِ احدیت کی طرف اشارہ ہے کہ وہی ازل الآزال میں ساری چیزوں کا اول ہے اور "ب"، اشارہ ہے ممکنہ موجودات کے اول کی طرف کہ مرتبۂ ثانیہ میں وجود کے ساتھ موجود ہے۔ "ت" کنایہ ہے ذات کی طرف بہ اعتبار تعینات و تعددات و تعلقات۔ یہ دراصل کلمہ طیبہ کی تعلیم کے ضمن میں بطور "اول الذکر" بیان ہوا ہے۔ جہاں الف **لا** ہے، ب **اِلٰہ** اور ت **اِلَّا اللہ** ہے۔ ث ولی ہے یعنے دوست کہ جس نے آدم کو بچالیا اور یہ اشارہ ہے مقیم کی طرف کہ مقیم ہی آقائے دو جہاں (حضرت **محمد** صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں جو منصبِ رسالت پر قائم ہیں یہی رسول

فقط کسی اور نبیِ مرسل کے ساتھ اُن کے نام کا جزو بن کر لکھا نہیں گیا۔ اسی مقام کی نسبت حضرت شیخ اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ قول اَلوِلَایَۃُ اَفضَلُ مِنَ النُّبُوَّۃ یعنے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولایت آپ کی نبوت سے افضل ہے۔ وارد ہوا ہے۔ دوسری بات کہ "ث" شئے ثبوت ہے کہ شئے خود بخود ثابت ہے بلا انتزاع کے جیسے کُرّہ کا جسم "بنفسہٖ موجود ہے" دوسرے معنی شئے موجود بنفسہٖ نہیں ہے لیکن اس کا منشا اس طرح پر ہے۔[1]

جیم جنت ہو بھیس لیایا   ح حوراں ہو آپ دکھایا
آپ شرابِ طہور پلایا

وَسَقٰھُمْ رَبُّھُمْ شَرَابًا طَھُوْرًا کی طرف اشارہ ہے۔ پھر ح کے نکتے کی وضاحت کو ناکافی جان کر حضرت قدس سرہٗ نے اسے پھر ایک مصرعہ میں واضح کیا ہے:

ح وحدت کی ری سمائیں[2]   وہی حقیقت میمی جانی
میم کی پیاروں بھر اُجتائی

یعنے وحدت سے ہی کثرت کا اظہار ہوا اور یہ سب موجودات کا ظاہر ہونا وحدت کی حقیقت ہے اور اس حقیقت کو صرف میم ہی جانے یعنی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی جانیں۔ لولاک لما خلقت الافلاک کی طرف اشارہ ہے۔

خ خارج کی مانہ گسائیں   ہوں توں ہو کر آیا سائیں
عین ثابت مانہ تھاری جوابھیں

یعنے وہ اعیانِ ثابتہ میں جس طرح سے تھا اسی طرح ظاہر ہوا اپنے علم سے۔ الاعیان ما شمّت رائحۃ الوجود سے بھی یہی مراد ہے کہ صورتِ عالم جو علمِ الٰہی میں ہیں وہ بعینہٖ ظہور نہیں پا سکتے بلکہ ہمیشہ علمِ الٰہی کے دائرہ میں ہی رہ گئے۔

[1] ان ساری وضاحتوں کے لیے مقدمہ فصوص الحکم از حضرت سید مبارک علی شاہ قادری گیلانی سے بھرپور استفادہ کیا گیا۔ ملاحظہ ہو صفحات ترجمہ فصوص الحکم ۹۵ تا ۱۳۲ مطبوعہ لاہور ۱۳۰۸ھ

[2] سمائی

دال وجہو تھیں غین کو عین کہیے
عین بھیس پہچاناؤں نہ لیجے
جیو تھیں تیو تصحیح عین کہیے

یعنے غیر کوئی نہیں ہے۔ وہی وہ ہے۔

ذال ذات کی بھاؤ دکھاوے
آپ ظہور کوں لوک کہاوے
پرکٹ ہو کیوں آپ چھپاوے

یعنے اپنی ذات کی قدر و قیمت جانتے ہوے بھی اپنے ظہور کو" پرلے" کا نام دے رہا ہے عجیب بات ہے کہ خود کو ظاہر کر کے خود کو ہی اپنے آپ میں چھپا لیا ہے۔

ر۔ رب اپنا آپ پچھانوں
غیر نہیں تو دوئی نہ جانوں
اک بن دو جا من نہ آنوں

اپنی یکتائی کی بنا دوسرے کے دل میں نہ رہوں، یعنے دل میں سوائے خدا کے دوسرا نہ رہے۔

زا زاری کہیں کہیں ہے ہانسا
کہیں سو غمزے کہیں نسا سا
کہیں صحب ہو کہیں ہے داسا

کہیں عاجز و مجبور و محتاج و غمزدہ ہے تو کہیں خوش و خرم، کہیں ناز و کرشمہ و ادا میں ہے تو کہیں آہ و بکا و نالہ و شیون میں۔ کہیں مالک ہے تو کہیں ملک اور کہیں آقا ہے تو کہیں غلام آیت فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ کی طرف اشارہ ہے۔

سین سلونے نین ہمارے
گھنگریالے بال تمھارے
یہے بھی بھیس پیا کے سارے

مطلب واضح ہے۔ جیسا تمھارا روپ ویسا ہمارا دیکھنا۔ جیسا منظر ویسا ناظر حسن تمھارا نظر ہماری۔

شین شاہد ہے ایک پیاپیہ   من میں اپیچ ایک کیا کر

بھر بھر پیالے یوں پیا کر

آیت کریمہ شہد اللہ انہ لا الہ الا ھو کی طرف اشارہ ہے۔

صاد صورت ہے جی جگماٹھاں   اور ترکیباں قیداں جا ٹھاں

اس رس کی پھیلا ہے مطلق ناٹھاں

حدیث قدسی خلق آدم علی صورتہٖ کی طرف اشارہ ہے۔ اگر آدم خدا ئے تعالیٰ کی صورت پر تخلیق نہ کیے گیے ہوتے تو وہ خدا کے خلیفہ کیوں کر ہو سکتے تھے۔ ان کے خلیفہ ہونے کی ایک وجہ ان کی صورت الٰہی ہے۔

ضاد سو المضل کیرتی   کیئے مظاہر آپ گھیری

"لول" دیے سو میری تیری

یعنے سارے مظاہر مضل ہیں اور وہ ضال ہے اور پھر چرچا "میرے اور تیرے کا کرتا ہے۔

ط طالب مطلوب سو آپیں   وہی محب محبوب سو آپیں

رب آپیں مربوب سو آپیں

آیت انا الموجود فاطلبنی تجدنی فان یطلب سوائی لم تجدنی کی طرف اشارہ ہے۔

ظ سو ظل بھیری سائیں   دیکھ محمد کہے گسائیں

یعنے منج بن دوجا ناہیں

حدیث: انا من نور اللہ والخلائق من نوری کی طرف اشارہ ہے۔ یعنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا حق تعالیٰ ہی کو دیکھنا ہے۔ آیت کریمہ: الم تر الی ربک کیف مد الظل کی تفسیر ہے۔

سانے یکی ری

عین کوں جیوں مانہہ عین نہ پکھو صاد صورت کیا من نہ پیکھو
واؤ وجود واحد کا دیکھو

صورت کا تصور دل میں کس طرح شمار کروگے جبکہ صحیح صورت کے بے شمار چہرے ہیں اور ہر چہرہ اپنے میں منفرد بھی ہے متمثل بھی ہے۔ اس لیے سب کو وہی واحد دیکھو۔

غین کا ٹمکا غین تھیں لیوٹ وہی کے اوپر سین، پ دلیو
ایم جانو تو عین کو جُووو

اسی عین (لعینہٖ کے معنوں میں) کے پہلے س اور ب لکھ دو۔ تو "سب عین" یعنے "سب وہی" ہو جائے گا۔

ف فانی ہو شہہ منہ کھووے پیو بدلیں تو باقی ہووے
رتی رتی منہ (ماز) پرکت جُووے

یعنے ہر ذرہ میں اسی کا ظہور ہے۔ کیا فنا اور کیا لقا۔

ق قلندر ہو کر آیا قٓ والقرآن آپ کہایا
آپ کہیا جی آپیں بھایا

وفی انفسکم افلا تبصرون کی طرف اشارہ ہے۔

ک کثرت منہ وحدت دیکھیں کثرت بھیس پیا کی پیکھیں
تج مج پیو تھیں جُوا نہ پیکھیں

ھو معکم اینما کنتم اور انا اعطینٰک الکوثر کی طرف اشارہ ہے کوثر معرفت ہے وحدت کی کثرت کی۔ اور کثرت معرفت کا نام ہے وحدت کی۔ وحدت کا شہود کثرت کا عین ہے۔

لاکھ لطافت لیا یا بھاری کہیں سوتر پکھا کہیں سوناری
آپ دکھاوے آپ سنواری

یعنی لذت سے آپ متلذذ ہے کہیں بہ شکل مرد اور کہیں بہ شکل عورت خود ہی اپنے آپ سے لطف اندوز ہے۔

میم محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہو کر آیا دلی سوا احمد آپ کہایا
وہی احد سب ہیں لیایا۔

یعنے حقیقتِ محمدی وحدت ہے اور حقیقتِ احمد کثرت۔ اشارہ ہے حدیث شریف انا احمد بلا میم (صلی اللہ علیہ وسلم)

ن نور ایسی آپ دکھالے سب ما نہ نور وجود کا چالے
لطیف کثیف ہو کھا کر کھالے

یعنے لطیف اور کثیف ہو کر سب کو حیرت میں ڈالے رکھا ہے اور پھر اپنے آپ کو بھی اس میں شامل کر رکھا ہے۔

واؤ وہی سب ہی وہی ہے جی تم دیکھو وہی ہی ہے
دیکھی جا کھی بات کہی ہے

۔ ہر شئے کی صورتِ مطلق ہے۔ یعنے ہر طرف اسی کا جلوہ ہے۔ جس طرف تم نظر ڈالو گے صرف ں کو دیکھو اور پاؤ گے۔ تجربے کی بات ہے جو کہی گئی ہے نیز اللہ نور السموٰت والارض رف اشارہ ہے۔

ھائے ھُو ھُو ہو رہیئے ہے جیدھر دیکھو ایک وہی ہے
چھانیں کوچ سو کھول کہی ہے۔

رف اسی کا جلوہ ہے اینما تولوا فثم وجہ اللہ ۔ ھا اعتبارِ ذاتِ بحت کا نام ہے اور یہ منقطع العشارہ ہے

غائب ہی غیب ہے اور یہی غیب "حق" ہے۔

لا توگھونگھٹ بھاری لیایا لا تعین ہو آپ چھپایا
احد، واحد ما نہ تفصیل آیا

لا تعین کا پردہ ہے اور یہ ایسا بھاری پردہ ہے کہ اٹھایا نہ جاسکے۔ اسی لیے وہ اس پردہ میں خود کو چھپائے ہوئے ہے اور ظاہر ہوا بھی تو احد، واحد میں ظاہر ہوا ہے یعنے یکتا و تنہا ہو کر تفصیل بنا۔ تفسیر قل ھو اللّٰہ احد ؁

ی یاری ہور دوستی میری یہ سب یاری دوستی تیری
ہے کیا کیجے بات گھنیری

یعنے اللہ رب العزت کا کوئی "غیر" نہیں ہے۔ وجود تو صرف اسی کا ہے کسی اور کا وجود تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ساری صفتیں یہ سارے افعال سب کا وہی مالک ہے اور سب اسی کے لیے ہیں اور سب اسی کے وجود سے ہیں۔ اب اس ضمن میں ایسی کیا بات چھپائی جاسکتی ہے اور اس چھپانے سے فائدہ بھی کیا ہے۔

غین کا ٹمکا من بھیں ہووُہ علی محمد شاہ منہ کھووُہ
عین علی جیوہ شاہ کوں جووُہ

آیت نحن اقرب الیہ من حبل الورید کی طرف اشارہ ہے۔ اسی مفہوم کا ایک شعر ہے

ادراک سے کچھ ہٹ کے ذرا دیکھ لے امید یہ کون لڑاکا تری شہ رگ سے قریں ہے[۱]

دنیا کی ہر مہذب زبان میں شاعری کو ایک پسندیدہ و شائستہ صنعت سمجھا گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ واردات قلبی کے اظہار کے لیے اس سے بہتر صنف اور اس سے اچھا کوئی ذریعہ انسانی زبان کو حاصل نہیں یہ ایک طرح کی وجدانی خود کلامی کا متاثر کن اظہار ہے۔ ہر وہ شخص جسے زبان پر قدرت اور کامل عبور ہو

[۱] یہ شعر حضرت شاہ امید نظامی شاگرد داغ دہلوی کا ہے۔

شعر کہے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ شاعری شخصیت کی تہ داری کے معلوم کرنے کا سہل ترین ذریعہ ہے۔ شاعر کا اپنے آپ سے بات کرنا اور طرح طرح سے خود کو مخاطب کرنا ایک طرح کی انانیتی تسکین ہے جسے وہ ہر حال میں برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف وہ اپنے آپ کو دکھاوے کا نمونہ بنا کر پیش کر ہی نہیں سکتا، وہ جیسا ہے ویسا ہی اپنے شعروں میں نظر آتا ہے اسی لیے اس مقام پر اس کی شان میں یہ کہا گیا تھا اَلشُّعَرَاءُ تَلَامِیذُ الرَّحمان ط

حضرت قدس سرہٗ کی ایک اور تصنیف

ملفوظات و بیاضِ خاندانی میں اشارتاً حضرت قدس سرہٗ کی ایک اور کتاب کا ذکر ہے جس کا نام خود شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے مِنَ الخِرَقِ الفَوَائِد خُلَاصَۃُ الجَوَاھِر رکھا تھا۔ مجھے تلاش کے باوجود یہ رسالہ دستیاب نہیں ہوا اس کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ عربی زبان میں تصنیف کیا گیا ہے

اس کے بارے میں مرتبِ ملفوظات کا بیان یہ ہے :

"آں شرائط السلوک تقویٰ اللہ تعالےٰ و دوام الوضو وخلوت والصوم
قلیل الطعام وقلیل الکلام وقلیل المنام والذکر جلی والخفی ونفی الخواطر وربط
القلب بالشیخ والعمل باوامر الشرع الشریف ظاہراً وباطناً وسمیت لھذا الاسانید
من الخرق الفوائد خلاصۃ الجواھر"

حیات

حضرت سیدی شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہ العزیز، اپنے جد سیدی سلطان العارفین شاہ عبدالرحیم محبوب اللہ کی دعا، پیشین گوئی اور بشارتِ صادقہ تھے۔ آپ جب پیدا ہوئے تو پنگوڑے ہی سے ولایت کا نور آپ کی جبینِ مبارک پر جگمگاتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ آپ اپنے وقت کے امام الاولیا، قطب الاقطاب، غوث الثقلین اور غوث الاعظم تھے۔ مسلکِ رفاعیہ و قادریہ کے فردِ فرید، عالم ارواحِ طیبہ کی روحِ سعید، رفاعی گھرانے کے چشم و چراغ اور اہلِ گجرات کی آبرو تھے۔ یہ انھیں کے دم قدم کا اثر تھا کہ دوارکا دیس میں وِشِشٹا ادویتا فلسفے Vishishta Advita Philosophy کو راہِ صواب مل گئی۔ اس کے تنِ بے روح، رخِ بے آب و قلبِ مردہ کو زندگی اور بے نور آنکھوں کو روشنی مل گئی۔ آپ نے مسیحا نفسی سے توحید کا صور ایسا پھونکا کہ اس کی گونج سے صوتِ سرمدی کانوں میں ھُوَ اللہ کے تار جھنجھنا گئے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے جدِ اعلیٰ کا پیغام عوام تک پہنچایا بلکہ اپنے عمل، نظریات اور تجربات سے توحید کا سبق کچھ ایسا سہل القبول بنا کر پڑھایا کہ خانقاہوں

اور درس گاہوں میں اسی کا آوازہ بلند رہا۔ گلی کوچوں میں اسی کے ترانے گائے جانے لگے اور ہر طرف اللہ ہی اللہ کا نعرہ سنائی دینے لگا لفظ وحدت الوجود کی بنسی کانوں میں رس گھولنے لگی اور گھر گھر

باجت گاجت سہیلی گانوسے رے پیچ روپ اچاکل کیری
آج ہماری عید ہی ہے نین سلونے دیکھے تیری

کا نغمہ گیتوں اور بھجنوں کی جگہ لینے لگا۔

آپ نویں صدی ہجری کے آخری دہے سنہ ۸۹۹ھ م سنہ ۱۴۹۱ء میں بزم آرائے عالم وجود ہوئے۔ اس وقت سلطنتِ دہلی پر سلطان سکندر لودھی حکمراں تھا۔ شیخ عبدالرحمان الاحمدیؒ نے آپ کی ولادت کی یہ تاریخ اپنے روزنامچے میں نقل کی ہے:

"تاریخ تولد شدن حضرت سید علی محمد بعد از ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
اقصار و شمار بعد ہشت صد و نود نہ" ۱؎

نام

ہمیشہ خدائے لم یزل کی حمد وثنا، ہر لمحہ باعثِ تخلیقِ کائنات کی محبت، مدحت اور تصور میں غرق رہنے والے اس عارف الوجود وبابرکت نمود کو سلطنتِ خداداد گجرات کے شہر احمد آباد میں **شاہ علی جیو**، شاہ علی محمد، **سید علی**، **علی جی**، **علی جیو**، **علی جی گام دھنی**، شاہ علی گجراتی، **شاہ علی احمد آبادی** کے نام سے جانا جاتا تھا۔ آپ کے دادا حضرت سیدی شاہ عمر نظر رحمۃ اللہ کے مرید و خلیفہ ابی الحسن شیخ محمد ابن عبدالرحمان القریشی الاحمدی نے اپنے ایک قصیدے میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کو اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا ہے: ؎

۱؎ قلمی بیاض مخزونہ سجادہ صاحب روضہ گام دھنی

شاہ من شاہ علی است ابنِ ابراہیم شاہ — ہست او خاتم ولایت افتخارِ اولیات

ایک اور جگہ آپ نے اپنی عقیدت کا اظہار یوں کیا ہے ؎

شاہ علی محمد بتو ختم ولایت است — ہم چو بنام جد تو ختم رسالت است

آپ کے کلام میں نام کی صراحت یوں ملتی ہے : ؎

کہیں سو ساتھی کہیں علی جیو علی محمد کہیں کہاوے — کہیں سو شاہ حسینی راجا یوں تل تل بھیس بھراوے

میں منج دھریا ناؤں سنکھاتے — شاہ علی جیو ہے منج ساتے

سید علی محمد آکھیے، کھیلا کھلار سو منج نترماے — سلطان سیدی احمد راجے بازی دو پر نرجھن جتاوے

یوں کہے نباتی سید علے — تجھ سادھ پریم کی سدھ تلے

جگ ما کھیں برکت ہوے ولے — کرناؤں سو اپنا سید علے

تو آہیں مانے رنگ رلے

ان شعروں میں "علی" مشترک ہے اور آپ کے جد کی پیشین گوئی کے مطابق

"شاہ ابراہیم ابن سید عمر را دو پسران شوند، در آں یک پسر را نام شاہ حسین شود۔ اما آں سید حسین شیر خوارہ بمیرد و دیگر پسر نام او علی کردد و بعضے محمد گویند بعدہٗ ہمہ متفق شدہ آں ہر دو نام را مرکب کنند و سید علی محمد گویند" لہ

خواص و عوام میں آپ سید علی محمد مشہور تھے۔ آپ کے نام کے ساتھ گاؤں دھنی یا گام دھنی بعد کا اضافہ ہے

پروفیسر نجیب اشرف ندوی لکھتے ہیں :

"شاہ صاحب اپنے عہد کے بڑے خدا رسیدہ بزرگ سمجھے جاتے

لہ قلمی بیاض مملوکہ سجادہ صاحب روضۂ گاؤں دھنی ۱۱

تھے اور عام خیال تھا کہ وہ جس کو جو کچھ چاہتے ہیں دے دیتے

ہیں اسی وجہ سے اِن کا لقب گاؤں دھنی (مالک الملک) تھا۔۱؎

لیکن احمد آباد میں عوام کی زبانی یہ روایت مشہور ہے کہ آپ کو سب سے پہلے لقب "گاؤں دھنی" سے ملقب کرنے والے آپ کے دادا سید عمر مظہر رحمۃ اللہ ہیں۔ یہ لقب دادا نے آپ کی پیدائش کے بعد آپ کا چہرہ دیکھ کر فرمایا تھا۔ یہ لقب اس قدر مقبول و مشہور ہوا کہ نام کا جزو ہی بن گیا۔ آپ کے روضۂ مبارک کے کتبے پر "گام دھنی" تحریر ہے۔ کثرتِ استعمال کی وجہ سے یہ زبان زد عام ہو کر "گاؤں دھنی" سے "گام دھنی" ہو گیا۔ لوگ آج بھی احمد آباد میں آپ کو "شاہ علی جی گام دھنی" ہی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

تخلص

حضرت قدس سرہٗ نے کثرت سے اپنے مکاشفات میں "شاہ علی جیو" ہی کو بطور تخلص موزوں کیا ہے۔ ؎

اے شاہ علی جیو گاؤں دھنی　　نت آوے اپنی کھیت بھنی

کہیں کہیں "علی محمد" اور کہیں "سید علی" سے بھی کام نکالا ہے۔ ایک آدھ جگہ "علی جیو" بھی بطور تخلص استعمال ہوا ہے۔ ؎

سب شاہوں کا جی شاہ اہے　　جس کیری چھند نہ کوئی لہے

جی کہوں علی جیو، جیو کہے

خطاب

سیدی سلطان شاہ عبدالرحیم رفاعی محبوب اللہ نے حضرت قدس سرہٗ کے پیدا ہونے سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے اپنی پیشین گوئی میں، جہاں آپ کی ولادت، نام اور بابرکت وجود کا ذکر فرمایا تھا وہیں آپ کو خدا کی طرف سے

۱؎ علی گڑھ تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۰۶

خطاب دیے جانے والے پندرہ خطابات کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

" ایں شاہ علی محمد، شاہِ کونین خواہد شد و امام الافراد و قطب الاقطاب
و غوث الثقلین و سلطان العارفین والعاشقین و محی الدین و غوث الاعظم
خواہد شد ایں سید علی محمد ابنِ شاہ ابراہیم را از حضرت حق تعالےٰ پانزدہ
خطاب عطا خواہد شد با مراتب آں در آں

یکے یا معشوقی شاہ علی محمد معشوق اللہ
دوم یا محی الدین شاہ علی محمد معشوق اللہ
سوم یا تاج العاشقین شاہ علی محمد معشوق اللہ
چہارم یا سلطان العارفین شاہ علی محمد معشوق اللہ
پنجم یا قطب العالمین شاہ علی محمد معشوق اللہ
ششم یا غوث الاعظم شاہ علی محمد معشوق اللہ
ہفتم یا کاشف الاسرار شاہ علی محمد معشوق اللہ
ہشتم یا معشوق الاعظم شاہ علی محمد معشوق اللہ
نہم یا سلطان الموحدین شاہ علی محمد معشوق اللہ
دہم یا امام المحققین شاہ علی محمد معشوق اللہ
یازدہم یا السیرازی شاہ علی محمد معشوق اللہ
دوازدہم یا امام الافراد شاہ علی محمد معشوق اللہ
سیزدہم یا سلطان العالم شاہ علی محمد معشوق اللہ

چہاردہم یا غوث الثقلین شاہ علی محمد معشوق اللہ

پانزدہم یا سلطان المعشوقین شاہ علی محمد معشوق اللہ

پس راوی مذکور می گوید بعدہٗ حضرت غوث العالم شاہ عبدالرحیم فرمودند رضی اللہ عنہ این بشارتہا اولاد من گفتیم از حضرت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام و از حضرت حق تعالےٰ تحقیق کردہ گفت ام "۔ ؎۱

جواہر اسرار اللہ کے مرتب اول نے اپنے دیباچے میں حضرت سیدی شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کے بارے میں تعارفی اشارے کے بعد لکھا ہے:

"سیدی و مرشدی و شیخی و شیخ العالم المخاطب من حضرت اللہ تعالےٰ بخمسۃ عشر خطابا الخ"۔ ؎۲

جواہر اسرار اللہ کے "باب الباء" کے آغاز سے قبل اس کے دونوں مرتبین نے حضرت شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کا ایک ایمان افروز و دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے جو دراصل اس مکاشفہ جا... کے لکھنے کا سبب تھا۔ مرتب اول کا بیان ہے:

"سبب فرمودند این مکاشفہ اینست حضرت سلطان الانبیا را شاہ علی محمد در معاملہ دیدن بعدہٗ بر پائے مبارک مالیدند، بعدہٗ سلطان الانبیا شاہ علی محمد را حالتی و ذوقی پیدا آمد و این مکاشفہ فرمودند۔ بعدہٗ حضرت سلطان الانبیا دستار خود بر سر شاہ علی محمد بستند و دعاے خیر بسیار کردند و فرمودند کہ "اے فرزند من ترا خدا ے تعالےٰ پانزدہ خطابہا با مراتب و مقام از حضرت خود عطا فرمودہ است تو آن خطابہا اظہار کن کہ من ہم چنین است"۔ ؎۳

؎۱ قلمی بیاض مخزونہ کتب خانہ سجادہ صاحب روضۂ گاؤں دھنی ۱۱

؎۲ مخطوطہ مخزونہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد۔

؎۳ مخطوطہ و قلمی بیاض سالار جنگ

...یانی نے اس واقعہ کو قدرے تفصیل سے یوں بیان کیا ہے اور ان کا بیان نسبتاً زیادہ واضح اور مفصل معلوم ہوتا ہے :

"چوں حضرت سلطان العارفین شاہ علی محمد معشوق اللہ، حضرت
سلطان الانبیا را در معاملہ دیدند بعدہٗ با توجہ تام بر پائے مبارک
آنحضرت بوسہ دادند و چشمہائے خود را با صدق بر پائے مبارک
مالیدند بعدہٗ سلطان الانبیا حضرت شاہ علی محمد را در کنار گرفت و دُعا
مزید عشق و محبت و فضل و مرتبہ بسیار فرمود و بسیار لطف و عنایت
نعمتہا کرد حضرت شاہ علی محمد را حالتی و ذوقی پیدا شد و ایں
مکاشفہ فرمود سلطان الانبیا بغایت خوش شد و دستار خود بر سر
حضرت شاہ علی محمد بستند و دعائے ترقی مکاشفات و مشاہدات
بے نہایت فرمودہ و فرمود کہ خدائے تعالیٰ ترا پانزدہ خطابہا با
مقامات و مراتب عنایت فرمودہ است۔ اے فرزند تو آں را در خلق
اظہار کُن"۔ لہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ان پندرہ خطابات کا اظہار، حضرت قدس سرہٗ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم مبارک کی تعمیل میں، اس طرح کیا ہے ؎

دو نہ جگ مانھیں ایجھیت دیکھوں تجکو شاہ علی جو میرے — سلطان عالم شاہ مینی ایسے ہی میٹھے ناویں سو تیرے
شاہ ابراہیم تن شاہ علی جیو سلطان عالم تجھے خطاب — آپس تیج لبھانان ساتھی ناؤں دھرے آپ ہی آپ
اپنیں جانوں نور نبی کا علی محمد ہو کر آیا — سلطان العارفین شاہ علی جیو رکیت ہو آپ کہایا

لہ مخطوطہ مخزونہ سالار جنگ حیدرآباد
آپ لبھانان

ان خطابات سے آپکے مقام و مرتبے، آپ کی عظمت و توقیر کا ایک امتیازی وصف سامنے آتا ہے۔ آپکے کمالاتِ باطنی اور اعلیٰ ترمراتبِ قرب و اتصالِ روحانی سے آپکے کلام جواہراسرار اللہ کا کوئی باب ایسا نہیں ہے جس میں آپنے اپنے معراجِ کمال کی نشاندہی نہ کی ہو۔ ابوالحسن شیخ محمد ابن عبدالرحمان القریشی الاحمدی کا ایک شعر ہے ؎

حاملانِ عرش می گویند با صد قیل جبیں عالم و عارف موحد عاشق و اہلِ صفات

خاندانِ عالی نسب

حضرت سیدی شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ نسباً ساداتِ موسویہ سے تھے۔ والدِ محترم کی طرف سے سیدی سلطان الصالحین محی الملت و دین سیدنا احمد کبیر الرفاعی رضی اللہ عنہ اور والدہ معظمہ کی طرف سے سیدنا بشیخنا محبوبِ اعلیٰ محبوبِ سبحانی پیرانِ پیر غوث الاعظم دستگیر ابومحمد سید الشیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ سے سلسلۂ نسب مل جاتا ہے۔ جواہراسرار اللہ کے مرتبِ اول ابی الحسن شیخ محمد ابن عبدالرحمان القریشی الاحمدی قدس سرہٗ نے اپنے مرتبہ دیوان کے دیباچے میں یہ نسب نامہ تحریر فرمایا ہے:

قطب الاقطاب العالم، غوث الاعظم، سلطان العارفین شاہ علی محمد معشوق اللہ الحسینی الاحمدی ابا الحسینی القادری اُمّاً ابنِ حضرت قطب العالم شاہ ابراہیم جمال اللہ ابنِ حضرت تاج العاشقین شاہ عمر مظہر رحمۃ اللہ ابنِ حضرت غوث الاعظم حضرت شاہ علی نور اللہ ابنِ غوث الاعظم شاہ عبد الرحیم محبوب اللہ ابن حضرت امام الافراد شاہ عمر جیش اللہ ابنِ حضرت سلطان الواصلین شاہ ابراہیم کنز نعمت اللہ ابن امام الافراد سید محمد معدن اسرار اللہ و محبت شہ ابنِ حضرت غوث الاعظم

سے آپ کو جیلی بھی کہا جاتا ہے۔

سلطان العارفین سلطان سیدی احمد کبیر معشوق اللہ الحسینی الموسوی الحسنی الرفاعی رضی اللہ عنہم اجمعین "

تذکروں اور تاریخِ ادبِ اُردو کے مصنفین کے یہاں آپ کے نسب مبارک سے متعلق معلومات کچھ یوں ہیں۔ میر علی شیر قانع لکھتا ہے:

"شاہ علی جیو گام دھنی قدس سرہٗ نبیرہ سید ابراہیم" ۱؎

حافظ محمود شیرانی مرحوم کا بیان ہے:

"سید احمد کبیر کی اولاد میں ہیں۔ قطب عالم شاہ ابراہیم بن شاہ عمر الحسینی الاحمدی کے فرزند ہیں" ۲؎

محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

"شاہ علی محمد جیو، قطبِ عالم شاہ ابراہیم جان اللہ کے فرزند اور مشہور بزرگ سید احمد کبیر رضؓ کی اولاد میں تھے" ۳؎

سید نجیب اشرف ندوی کا خیال ہے:

"ان کے والد کا نام شاہ ابراہیم اور دادا کا نام عمر الحسینی تھا۔ بعض مورخین نے ان کو نبیرۂ سید عبدالرحیم لکھا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ ان کے پردادا ہوں" ۴؎

عبدالرحمٰن ٹکاپوری کے الفاظ یہ ہیں:

آپ کی نسب کا سلسلہ سید احمد کبیر رفاعی رضؓ سے پہنچتا ہے اور آپ کی ننہال کا سلسلہ محبوب سبحانی رضؓ سے ملتا ہے۔ غرض آپ نجیب الطرفین

۱؎ تحفۃ الکرام جلد اول ص ۲۱

۲؎ مقالاتِ شیرانی جلد اول ص ۱۰۳

۳؎ اردو شہ پارے جلد اول ص ۱۲

۴؎ علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۱۰۶

شریف السلسلتین سے ہیں" ۔ [1]

سید ظہیر الدین مدنی نے تحریر کیا ہے :

"شاہ علی محمد جیو قطب عالم شاہ ابراہیم بن شاہ عمر الحسینی الاحمدی کے فرزند ہیں۔ علی جیو کو سید احمد کبیر سے نسبی تعلق ہے " ۔ [2]

نصیر الدین ہاشمی کی تحقیق یوں ہے :

"شاہ علی محمد گاؤں دھنی شاہ ابراہیم جان اللہ کے فرزند تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب سید احمد کبیر رفاعی سے ملتا ہے اور ننہال کا سلسلہ سیدنا عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے" ۔ [3]

غلام الدین گلشن آبادی کا کہنا ہے :

"آپ سادات موسویہ سے ہیں۔ نسب مادری آپ کی حضرت غوث الاعظم رح کو چند واسطوں سے پہنچتی ہے اور سلسلۂ جدیہ آپ کا اس طرح مرقوم ہے، شاہ علی جیو بن سید ابراہیم بن سید عمر بن سید علی بن سید عبدالرحیم بن سید شریف شاہ عمر بن سید شریف شاہ ابراہیم بن سید شریف شاہ محمد بن سید احمد کبیر رفاعی رح ہے" ۔ [4]

ڈاکٹر زور مرحوم اور نصیر الدین ہاشمی نے شاہ صاحب کے والد شاہ ابراہیم کا لقب غلط لکھ دیا ہے یا ہو سکتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک نے دوسرے کے بیان پر اعتماد کیا اور اسے نقل کر دیا ہے۔ تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کی۔ حقیقتاً حضرت شاہ ابراہیم کا لقب "مظہر جمال اللہ" تھا۔ جان اللہ نہیں تھا۔ علی شیر تلعی نے حضرت قدس سرہ کے دادا کا نام شاہ ابراہیم لکھا ہے جو سراسر غلطی پر مبنی ہے۔ دراصل ان کے دادا

[1] مجموعۂ ذی المنن تذکرۂ اولیائے دکن صفحہ ۲۹۰

[2] سخنوران گجرات صفحہ ۹۵

[3] فہرست اردو مخطوطات جلد دوم صفحہ ۱۸۳

[4] تاریخ الاولیا صفحہ ۱۳۵

کا [illegible] شاہ عمر اور لقب مظہر رحمۃ اللہ تھا۔ مولوی عبدالحق نے علی شیر قانع کا بیان نقل کرنے کے بعد "بقول صاحب تحفۃ الکرام آپ سید عبدالرحیم کے پوتے ہیں[۱]" لکھا ہے۔ صاحب شرف الانساب نے آپ کا [illegible] تا آخر (عدنان) اس طرح بیان کیا ہے:

"نسب نامہ شاہ علی جیو گاؤں دھنی[۲]، وفات ۹۷۰ھ، مزار احمد آباد گجرات، آپ ساداتِ حسینی سے ہیں:

شاہ علی جیو گاؤں دھنی بن سید ابراہیم بن سید عمر بن سید علے بن سید عبدالرحیم بن سید شریف شاہ عمر بن شاہ ابراہیم بن سید شریف شاہ محمد بن سید شریف السید احمد کبیر الرفاعی بن سید نورالدین ابوالحسن علی مکی المعروف بہ سلطان المکی بن سید محی الدین یحیٰ بن ثابت بن عازم بن سید علی بن سید حسن بن سید ابی القاسم محمد بن سید حسین بن سید احمد الاکبر بن سید موسیٰ ثانی ابو سبحہ بن سید ابراہیم الاصغر عرف سید مرتضیٰ بن سید امام موسیٰ کاظم بن سیدنا امام جعفر الصادقؓ بن سیدنا امام حسینؓ بن سیدنا علی کرم اللہ وجہہ بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدالمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان"[۲]

حضرت سیدی قدس سرہ کے مادری نسب کا سلسلہ کسی بھی کتاب میں مجھے نہ مل سکا البتہ جواہر اسرار اللہ [illegible] مخزونہ کتب خانہ پیر محمد شاہ گجرات احمد آباد کے نسخے کے صفحے ۹ پر حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی والدہ معظمہ کا نسب نامہ

۱۔ مولوی [illegible] اردو جلد ۸ جولائی ۱۹۲۸ء حصہ ۳۱ صفحہ ۲۵۔

۲۔ شرف الانساب صفحہ ۴۶ و دیگر اولاد سید ابراہیم صفحہ ۲۴۴۔ صاحب شرف الانساب نے حضرت قدس سرہ کی وفات ۹۷۰ھ غلط لکھا ہے۔

کاتب نے اس طرح تحریر کیا ہے :

" والدۂ ماجدہ حضرت قدس سرہٗ العزیز، حضرت سید محمد ابن حضرت
قطب الاقطاب شاہ عبدالوہاب عرف حضرت میاں سیدہ شاہ جی حسنی
الحسینی القادری قدس سرہٗ می شوند "

خاندانِ عالیہ

حضرت سید شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کا تعلق " موسوی[۱] " گھرانے سے ہے ۔ آپ اس خاندانِ عالی کے ایسے نورانی و روشن چراغ تھے جس کی ضیا پاشیوں سے گجرات کے تیرہ و تار راستے، محلات و محراب، کوچہ و بازار ایسے منور و تابناک ہو گئے کہ جہل و بطل کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ آپ کے جد، سیدی سلطان شاہ عبدالرحیم محبوب اللہ رفاعی[۲] ، جو سیدی امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کے شجرِ طاہر کی سترھویں شاخِ سرسبز اور ارضِ ہند پہ قدم رنجہ فرمانے والے خانوادۂ رفاعیہ کے پہلے بزرگ ہیں۔ جنھوں نے اس ملک کو اپنا وطنِ ثانی اور خطۂ مالوف بنالیا اور گجرات کو سکونت اور اشاعتِ دین کے لیے پسند فرمایا ۔ یہاں کی محبت بھری فضا، پریم و پیار کے عطر بیز ماحول میں گھلی ہوئی آب و ہوا نے آپ کے قلبِ نیاز کو عشق و محبت سے بھر دیا تھا۔ یہاں کے آب و گِل سے آپ کو ایسی مناسبت و انسیت ہو گئی کہ آپ یہیں کے ہو رہے تا تشنگانِ توحید کو مئے وحدت پلا کر سرشار و سیراب رکھنے کا کام آپ کے بعد آپ کی اولاد میں بھی باقی و جاری رہے ۔

سلطان شاہ عبدالرحیم رفاعی محبوب اللہ، بمقام عویزہ مکہ مکرمہ، سنہ ۱۲۹۰ء م ۶۸۹ھ ہجری رونق افروز عالم ہوئے ۔ کم سنی ہی میں اسلاف و اجداد کے اخلاقِ عالیہ و کردارِ طاہرہ کی جیتی جاگتی و سچی تصویر تھے۔ سنِ شعور کو

۱؎ حضرت سیدنا موسیٰ کاظم رضی کی اولادِ اطہار کے خاندان کو " موسوی " کہا جاتا ہے ۔ ۱۲

۲؎ گجرات کے قبل حضرت حاجی رجب [illegible] میں تشریف لا چکے تھے لیکن اولاد [illegible] آپ کی [illegible] حضرت عالم رفاعی کے [illegible] اولاد کے آپ سے پہلے ہندوستان تشریف لائے ۔

پہنچے تو اپنے والدِ ماجد سیدی شاہ عمر حبیش (جلیس[1]) اللہ رفاعی رضی اللہ عنہ سے باطنی تربیت پاکر تلقین و تفہیم پاکر
ان کے سب سے چہیتے (دلائق) فرزند ثابت ہوئے۔ پھر قاعدے کے مطابق مکتب کی تعلیم حویزہ کے قابل و جید
علماء سے حاصل فرمائی۔ جب تمام معاملاتِ دینیہ میں کامل استعداد پیدا کر لی تو اس کی تکمیل کی سند کے طور پر
آپ کے والدِ محترم نے مشائخینِ مکہ مکرمہ کی موجودگی میں آپ کو خرقۂ خلافت و لباسِ فقر زیب تن پہنا کر خانوادۂ
عالیہ رفاعیہ کے منصبِ رشد و ہدایت پر فائز فرمایا۔ آپ کی ذاتِ قدسی صفات کی ایک امتیازی شان
یہ ہے کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق و تقدیس کے لیے خود اپنے دستِ مبارک
سے آپ کو خرقۂ فقر پہنایا اور ہدایت فرمائی کہ ہندوستان کی طرف ہجرت کر جائیں۔ آپ نے امتثالِ امر و
تعمیلِ ارشادِ رسولِ محتشم و مکرم صلی اللہ علیہ وسلم، ارضِ ہند کا رخ فرمایا اور ۱۳۵۱ء م ۷۵۲ھ نہروالہ (پٹن)
کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے برکت دی۔ اس وقت سلطنتِ دہلی پر سلطان فیروز شاہ تغلق اپنے تایا زاد بھائی
محمد تغلق کی جگہ تخت نشین تھا کچھ عرصہ بعد فیروز شاہ، ۱۳۸۷ء م ۷۸۹ھ میں اپنے بیٹے محمد شاہ کو ناصر الدین
کا خطاب دے کر تختِ دہلی سے دست بردار ہو گیا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ آپ کے ورودِ ہند پر صاحبِ روضۃ الانساب
یوں رقمطراز ہے:

"خرج الشیخ الشریف السید عبد الرحیم بن السید عمر حبیش اللہ الرفاعی من حویزہ الی مکۃ المشرفۃ
وکان سنۃ اثنی و خمسین و سبعمائۃ ثم سافر الی الہند و ساح کثیراً من البلاد و
سکن البلاد و سکن بہ بلدۃ پیران پٹن ثم توطن فی آخر عمرہٖ باحمدآباد الی ان توفی۔"[2]

مؤرخ تاریخ قانع کا بیان ہے:

"سید عبد الرحیم از نژاد سید احمد کبیر رفاعیت، سلطان پورہ بیرون دروازہ، د
دروازۂ رائے پورہ آباد کردہ ایشان است۔"[3]

[1] آپ کے یہ دو لقب مشہور ہیں۔ یعنی حبیش اللہ اور جلیس اللہ دونوں ہی لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ صہ ۱۲

[2] بحوالہ الجوہرۃ الاحمدیہ قلمی مخزونہ سید کمال الدین رفاعی بڑودہ صہ ۱۵

[3] تحفۃ الکرام جلد اول صہ ۱۴

ہندوستان میں آپ کی تشریف آوری کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتی تھی کہ اشاعتِ دینِ متین وفیضِ رسالتِ خلق کے منشاءِ ایزدی کی تکمیل ہو اور تعلیمات سیدنا احمد کبیر رفاعی رضی اللہ عنہ عام ہوں تاکہ اس کی برکت سے قلوب منور، روح پاکیزگی حاصل کرے۔ سلطان شاہ عبدالرحیم رفاعی رضی اللہ عنہ کے ورودِ ہند کے بارے میں شجرۃ الاحمریہ میں یہ عبارت ملتی ہے:

"السید نجیب الدین عبدالرحیم محبوب اللہ ایضاً اسمہٗ ابراہیم موافق لاسم جدہٖ وھو اول من دخل الھند من ھٰؤلاءِ السادۃ واصلہٗ من عراق"۔ [1]

آپ کثیر الکرامات وانعاماتِ خداوندی کے مظہر تھے۔ تمکنت میں آپ کے قدم قوی و غیر متزلزل تھے۔ آپ کی زندگی کے لمحات اتنے پاکیزہ و مقدس تھے کہ جو آپ کو صدقِ نیت سے دیکھ لیتا اس کے قلب پر انوار ونور کا ظہور ہو جاتا اور جس کسی پر آپ توجہ کی نظر فرماتے اسی وقت اس کے قلب کی کیفیت بدل جاتی اور وہ خود اپنی اس کیفیت کو اپنی باطنی آنکھوں سے دیکھ لیتا۔ جب آپ کسی کو اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کر لینا چاہتے تو اس کے قلب کی ایسی اصلاح فرماتے کہ اس کی کایا پلٹ ہو جاتی اور وہ واصلینِ حق میں شمار ہو جاتا اور وہ اپنے مقام و مرتبے کو خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیتا۔ آپ کے جس قدر بھی مرید ہوئے سبھی ولایت کے اعلیٰ تر درجات پر فائز ہوئے۔ غالباً آپ کی ہندوستان میں آمد کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہوگی کہ اس ملک کو رفاعی اولیائے کرام کے بابرکت وجود سے بھر دیا جائے اور ایک مقصد یہ بھی ہو کہ "بوئے حبیب [2]" آشکار ہو جائے۔

سلطان شاہ عبدالرحیم رفاعی رضی اللہ عنہ کے اخلاق حد درجہ کریمانہ تھے۔ باوجود "قطب المدار" کے درجے پر اور شیخ المشائخ کے منصب پر فائز ہونے کے اپنے کو سب سے حقیر سمجھتے۔ منکسر المزاج ایسے کہ کسی پر اپنا حال کبھی منکشف ہونے دیا۔ شہرت، نام و نمود بالکل ناپسند تھی۔ آپ کے استغنا، رعب و دبدبہ کا یہ حال تھا کہ آپ کے ارشادات و ملفوظات اور نہ کوئی آپ کی رضامندی حاصل کیے بغیر قلمبند نہیں کر سکتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہو کہ کسی نے آپ کے حالات جمع کر نے

[1] شجرۃ الانوار ص ۱۳۱

[2] سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کی طرف اشارہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے مشرق کی سمت سے دوست کی خوشبو آتی ہے۔ ۱۲

اور آپ کی حیاتِ طیبہ کے واقعات قلمبند کرنے کی جسارت نہیں کی جبکہ آپ ہی سے خرقہ پانے والے اور آپ ہی کے تربیت یافتہ اصحاب و ارادت مندوں کی زندگی کے تفصیلی واقعات سے تذکرہ نویسوں کے اوراق بھرے پڑے نظر آتے ہیں۔ یہی حال من وعن سیدی شاہ علی جیو گاؤں دھنی کا بھی ہے۔

آپ کے قابلِ ذکر خلفاء میں حویزہ کے وہ شیوخ جنھیں تلقین و تعلیم کے بعد خرقہ ملا یہ ہیں:

الشیخ عارف باللہ حامد بن عمر العراقیؒ۔ الشیخ عثمان ابن احمد المکیؒ الشیخ شہاب ابن عبدالصمد الحویزیؒ۔ الشیخ عبدالرحمان بن احمد سہروردیؒ، الشیخ جمال الدین ابن ادریس بداونیؒ الشیخ احمد بن محمود بن ادریس الحنی والبغدادی القادریؒ الشیخ یعقوب بن جمال بن فیروز چشتی الشیخ نورالدین بن کمال الدین عمر الدمشقی قدس اللہ اسرارہم۔

ہندوستان میں شہر نہروالا (پٹن) میں جن شیوخ نے آپ کی صحبت میں رہ کر خرقہ پایا وہ یہ ہیں:

الشیخ شرف الدین المشہدیؒ الشیخ سید برہان الدین ابن سید محمود ابن جلال الدین حسینی البخاریؒ۔ سلطان احمد بن محمد مظفر شاہ حضرت شیخ چھچو اساولی الاحمدی شیخ احمد کھٹو المغربی قدس اللہ اسرارہم۔

شیرازی بزرگوں میں:

الشیخ علم الدین علی ابن احمد الکاری الشیخ حسن ابن دانیالؒ الشیخ محمد القادری المخزومیؒ الشیخ عبداللہ بن محمود باحضریؒ الشیخ عبدالمنعم بن شیخ حازم الخراسانی المدنی۔ الشیخ اسمٰعیل ابن حسن الواسطیؒ الشیخ سلطان حاتم البصریؒ الشیخ ثابت ابن محمد المکی الشیخ مہدی ابن احمد ابن داؤد الرفاعی الشیخ عبدالکریم ابن عبداللہ احمد القریشی العیدروسیؒ قدس اللہ اسرارہم۔

حویزہ کے وہ بزرگ جنھوں نے مدت العمر آپ کی صحبت میں رہ کر استفادہ فرمایا، تلقین و ہدایت، شرف بیعت و خرقہ خلافت حاصل کیا ان کی تعداد بے شمار ہے کہ ان صفحات میں اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے چند ایک کے اسماء حسبِ ذیل ہیں:

الشیخ محمد بن سلطان العارفین شاہ عبدالرحیمؓ ، سید احمد رفاعیؒ سید حسن رفاعیؒ سیدہ شاہ حسین سیف اللہ الحسینی الرفاعیؒ الشیخ عبدالرحمان الفاروقی الاحمدیؒ الشیخ محمد الواسطیؒ الشیخ نورالدین ابن غیاث الدین رفاعیؒ الشیخ نورالدین ابنِ غیاث الدینؒ الشیخ اسحٰق ابراہیم الاحمدیؒ الشیخ حسین ادریس الاکریؒ الشیخ موسیٰ ابن یحییٰ شیرازیؒ شیخ سلیمان ابن محمد القریشی الواسطیؒ قَدَّسَ اللّٰہُ اَسْرَارَھُم لہ ان کے علاوہ آپ کے مریدوں کی تعداد لاکھوں میں ہے کہ گنتی نہیں کی جا سکتی۔ ان کی تعداد کا حصر ممکن نہیں۔ ملفوظاتِ شاہ عبدالرحیم رضی جسے شیخ عبدالرحمان الفاروقی الاحمدی نے مرتب کیا ہے، آپ کے صاحبزادے سیدی شاہ علی نوراللہ کی ولادتِ طیبہ کا ایک ایمان افروز واقعہ درج ملتا ہے جسے آپ کے دو نامور خلفاء شیخ عبدالکریم ابن شیخ عثمان القریشی الاحمدی و الشیخ حسن ابن عبدالرحمان الاحمدی نے نقل کرتے ہوئے اس واقعہ کی توثیق کی ہے۔

پیر کی آخرِ شب ، سیدی سلطان العارفین ، غوث الاعظم سیدنا احمد کبیر الرفاعی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ ، شیخ المشائخ قطب الاقطاب الشیخ حاجی رجب المعروف بہ سلطان محمد امیر الروم الاحمدی رضی اللہ عنہ کے روضۂ مبارک میں صاحبزادہ شاہ علی نوراللہ پیدا ہوئے تو حدِ نگاہ تک زمین و آسمان میں ہر سمت نور ہی نور پھیل گیا تھا۔ روضۂ مبارک کے حدود کا جہاں تک سلسلہ جاتا تھا روشنی کے باعث اس کا گوشہ گوشہ تابناک و منور ہو گیا۔ تاریکی روزِ روشن کے اُجالے میں بدل گئی ، لوگ ایسی روشنی دیکھ کر حیران و متعجب ہوئے سمجھے کہیں آفتاب تو طلوع نہیں ہوا ! جو نیند میں تھے وہ سراسیمہ ہو کر اُٹھ بیٹھے ، جو جاگ چکے تھے انھیں اس واقعۂ عجیبہ پر یقین ہی نہیں آتا تھا بلکہ حیرت و استعجاب ہر لمحہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ خشیت و خوف سے کسی ایک کی گھگی بندھ گئی ، تحیّر کی شدت سے زبانیں گنگ اور آنکھیں پتھرا گئیں۔ کچھ دیر بعد جب اوسان برجا ہوئے تو سب نے عظمتِ الٰہی و کرشمۂ قدرت کے اظہار پر نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ بعضوں نے اسے رحمتِ الٰہی جان کر درودِ شریف پڑھنا شروع کیا۔ یہ منظر اس قدر ایمان پرور، روحانیت بخش اور وجد آفریں تھا کہ مسلسل تین گھنٹے تک چار ہزار افراد نے اس واقعۂ عجیبہ

لہ یہ ساری معلومات ملفوظاتِ شاہ عبدالرحیم رض (عربی اردو) قلمی مخطوطہ کتب خانہ سجادہ صاحب روضۂ الاحمدی سے ماخوذ ہیں۔

کی زیارت سے مشرف ہو کر فیوضات و برکات سے مستفید ہوئے اور دیر تک ہمہ تن رقصاں و وجد کناں رہے۔
درود و حمد و ثنا کی روح پرور صداؤں کے بلند ہوجانے سے ساری فضا معطر و مسحر ہوگئی۔ شور و غل نے اطراف و اکناف کو متاثر اور سکوت بھرے ماحول کو منقلب کردیا تو تب حضرت سیدی سلطان شاہ عبد الرحیم رفاعی محبوب اللہ اپنے کمرے سے برآمد ہوئے اور لوگوں سے فرمایا: "ایسا شور نہ مچائیں"۔ رعب و مسرت کے ملے جلے جذبات سے پر ہو کر بعضوں نے بہ عجز و انکساری حضرت سے دریافت فرمایا: اے غوث العالم! یہ روشنی کیسی؟ یہ نور کیا ہے؟ ہم نے ایسا نور اور ایسی روشنی کبھی نہیں دیکھی اور نہ ہمارے کان ایسے کسی واقعے کے ظہور پذیر ہونے کی بات سے آشنا ہیں، للہ کچھ تو فرمایئے! آپ نے فرمایا: لوگو! اس وقت میرا لڑکا پیدا ہوا ہے وہ اللہ کا نور ہے جس کے نور سے یہ ساری فضا منور ہوگئی ہے میں اس موقع پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میرا یہ نومولود نہایت مبارک و بابرکت ہے۔ اس کی اولاد میں یکے بعد دیگرے امام الافراد، قطب العالم، غوث الثقلین وغیرہ ہوں گے اور ان سب کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے سلطان الصالحین و قطب العالم کے خطابات عطا ہوں گے۔ پھر فرمایا، اے لوگو! میرے اس لڑکے کو کثرت سے اولاد ہوگی۔ ان میں سے ایک جس کا نام عمر ہوگا وہ اللہ کی طرف سے رحمۃ اللہ کا خطاب پائے گا اور اس کی اولاد میں سے ایک سید ابراہیم ہوگا جسے اللہ تبارک و تعالیٰ جمال اللہ کے خطاب سے سرفراز فرمائے گا۔ اس لڑکے ابراہیم جمال اللہ کے یہاں دو لڑکے ہوں گے۔ ایک کا نام سید حسین اور دوسرے کا سید علی۔ جس کا نام سید حسین ہوگا وہ قضائے الٰہی سے عالم شیر خوارگی ہی میں انتقال فرمائے گا اور جو سید علی ہوگا اسے بعض لوگ سید محمد اور بعض سید علی سے یاد رکھیں گے اور پھر سب لوگ اس کے دونوں ناموں پر متفق ہوں گے اور "سید علی محمد" مخاطب کریں گے۔ یہی وہ مبارک و مسعود لڑکا ہے، جو اپنے وقت کا قطب الاقطاب، غوث الثقلین، سلطان العارفین و العاشقین، امام الافراد ہوگا اور اللہ تبارک و تعالیٰ

اس کے مرتب کو بلند کرے گا اور اسے پندرہ خطابات سے سرفراز فرمائے گا۔ اصل مخطوطے کی عبارت کے

الفاظ یہ ہیں:

"شاہ عبدالرحیم فرمود رضی اللہ عنہ کہ ایں زماں پسرِ من تولد شدہ است او
انوار اللہ وایں نور از داست و شکرانہ می کنم کہ ایں فرزندی بسیار مبارک
است وایں پسرِ من شاہ علی قطب خواہد شد بعدہٗ امام الافراد بعدہٗ
قطب العالم و غوث الثقلین خواہد شد واو را از حضرتِ حق تعالیٰ خطاب
سلطان الصالحین و قطب العالم خواہد شد واو مخاطب بخطاب اللہ شاہ علی
نور اللہ خواہد شد وایں پسرِ من شاہ علی سلطان الصالحین را بسیار پسراں
خواہد شد در آں یک پسر را نام سید عمر خواہد شد وایں شاہ عمر بن علی در
آخر عمر خود قطب الاقطاب خواہد شد واو مخاطب از حضرتِ حق تعالیٰ بخطاب
شاہ عمر رحمت اللہ خواہد شد وایں سید عمر بسیار پسراں خواہد شد دراں یک
پسرے باشد کہ نام او سید ابراہیم خواہد شد وایں شاہ ابراہیم در آخر عمر
خود قطب خواہد شد بعدہٗ قطب الاقطاب امام الافراد و قطب العالم خواہد شد و
او مخاطب از حضرتِ حق تعالیٰ بخطاب شاہ ابراہیم جمال اللہ خواہد شد و
چونکہ قطب العالم شود آخر عمر او باشد و در اندک روز شہید گردد وایں شاہ ابراہیم
ابن سید عمر را دو پسراں شوند در آں یک پسر را نام شاہ حسین شود اما آں
سید حسین شیر خوارہ بمیرد و دیگر پسر شود نام او علی کردد و بعضے محمد گویند بعدہٗ ہمہ
متفق شدہ آں ہر دو نام را مرکب کنند و سید علی محمد گویند بعدہٗ ایں شاہ

علی محمد، شاہ کونین خواہد شد و امام الافراد و قطب الاقطاب و غوث الثقلین و سلطان العارفین والعاشقین و محی الدین و غوث الاعظم خواہد شد و ایں سید علی محمد ابن شاہ ابراہیم را از حضرت حق تعالیٰ پانزدہ خطاب عطا خواہد شد۔[۱]

پھر سیدی سلطان الصالحین شاہ عبدالرحیم الرفاعی محبوب اللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "یہ بشارت اور یہ نور جو سات آسمان در حدود وجہات روضۂ حاجی رجبؒ کا احاطہ کیے ہوئے جو نظر آرہا ہے دراصل یہ اسی بابرکت و مسعود لڑکے شاہ علی محمد کا ہے۔ میری یہ بشارت اسی نورِ نظر کے لیے ہی ہے۔ میں یہ اعلان حضور سرکارِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تبارک و تعالیٰ سے بعد تصدیق و تحقیق کے کر رہا ہوں"۔

پھر آپ نے فرمایا: اے لوگو! گواہ رہو، میرا وہ لڑکا شاہ علی محمد جو آئندہ سلطان العارفین شاہ علی محمد مشہور ہوگا میں اس کو اپنا جانشین بناتا ہوں، وہ میری جگہ پر میرے بجائے میرا سجادہ نشین ہوگا اور اس کا قدم مجھ سے اور میری تمام اولاد سے اور تمام قرابت داروں سے درجۂ عاشقیت و مقامِ معشوقیت میں بلند تر ہوگا اور تمام مراتب محبوبیت و معشوقیت میں جزو کل کے ساتھ جملہ مشائخین سے جو میرے آبا و اجداد سے سوائے سیدنا احمد کبیر الرفاعی رضی اللہ عنہ کے افضل تر ہوگا۔ اس کے اقوال، اس کے افعال، اس کے احوال اور اس کے طور و طریق حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کے عین مطابق ہوں گے۔ وہ اپنے جدِ سیدنا احمد کبیر الرفاعی رضی اللہ عنہ کے اخلاق و عادات و اوصافِ عالیہ میں ان کا ہم قدم ہوگا اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع کی برکت کے باعث محی الملت، صاحبِ شریعت، حالِ طریقت، واصلِ حقیقت، شیخ المرشدین و المحققین، امام الافراد، سلطان العاشقین والمعشوقین و محبوبِ رب العالمین ہوگا۔

"سکر المزاجی" خاندانِ عالیہ رفاعیہ کے بزرگوں کا وہ خصوصی وصف ہے کہ اس وصف و شرف میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ یہ وہ وصفِ قدسی ہے کہ جس نے اک عالم کو اپنا گرویدہ اور زمانہ بھر کو اپنا حلقہ بگوش

[۱] مخطوط مخزونہ کتب خانہ سجادہ حبیب روضۂ گلاوں دھٹی، احمد آباد ص ۳۲ اردو م

بنا رکھا ہے ان کی ادنیٰ غلامی کی جسے عزت مل گئی اس نے حکمرانی عالم کا تاج اپنے سر پر رکھ لیا اور ان کے نعلینِ پاک کو سر پہ اٹھا لینے کی سعادت جسے حاصل ہو اسے اپنے آپ پر کیوں کر نہ ناز ہوگا۔ قابلِ رشک و تحسین ہے وہ دامن کہ جو ان کے گوشۂ چشم کرم کا منتخب ٹھہرا اور جس کے آستینِ بے مایہ کو ان کے علم و عرفان کا فیض مل گیا۔ وہ کیوں نہ اترائے جس کا چاکِ گریباں راہی کے قدموں کی اٹھی ہوگرد کا حامل ہوکر بیش قیمت جواہر آبدار کے مقابل گراں قیمت ٹھہرا۔ یہ سب اسی ذاتِ مجمع کمالات کا فیض ہے جس کی وسعتِ نظر کا احاطہ کرنا ناممکن ہے جسے دنیا محی الملت سلطان الواصلین سیدنا احمد کبیر الرفاعی رضی اللہ عنہ کے نام سے جانتی ہے[ل]

سلطان شاہ عبدالرحیم محبوب اللہ رفاعی رضؓ طویل العمر حیات رہے اس تمام عرصہ میں تقویٰ و طہارت ذکر و اذکار صوم و صلوٰۃ اشغالِ قدسیہ اعمالِ طیبہ کے معمولات میں سر مو فرق نہ آنے دیا۔ جب منشاءِ ایزدی پورا ہو چکا اور آپ کا رشد و ہدایت تعلیم و تلقین کا کام مکمل ہوا تو وصل کا پروانہ اذن آ گیا آپ سجدۂ شکر بجا لا کر بعمر ۱۲۴ سال بتاریخ ۷ ار رمضان المبارک ۸۱۳ھ م ۱۴۱۰ء اس جہانِ فانی کو خیرباد کہا۔ مرآۃ احمدی کا مصنف کا لکھتا ہے:

A Desendent of Syyid Ahmed Kabir.

He is burried in his Village of Sultanpura out side of the right side gate. His anniver-sary is celebrated 14th Shawwal.

(supplament to Mirat-e-Ahmedi p: 64)

== Edn 1924 ==

مصنف کا بیان محلِ نظر ہے۔

ل آپ کی ولادت ...

حضرت سید شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کا بچپن

گجرات پیار و محبت کے مرکزِ اولیٰ، امن و بھائی چارہ کے مثالی ماحول، صلح و آشتی کے حسین و جمیل گہوارے احمد آباد میں آپ نے آنکھ کھولی۔ اس کی مدھ بھری فضاؤں اور دل موہ لینے والے مناظرِ قدرت اور علم و عرفان میں ڈوبے شام و سحر میں ایامِ طفلی کا یادگار زمانہ گزارا۔ شاہ عبد الحق محدث دہلوی، گجرات کی خوبیوں کے اس طرح مداح ہیں:

"درحقیقت اس سرزمین سے عشق و محبت کی خوشبو آتی ہے اور اس کے ویرانوں سے برکت اور ولایت کا نور جھلکتا ہے۔" (انوار الصوفیہ ص ۲۳۵)

بلادِ دکن سے گجرات ایک وسیع ترحصۂ ملک پر پھیلے ہوئے اس صوبے کا نام تھا جس کی حدیں ایک طرف بیسے کا بری اور دوسری سمت راجستھان کے ریتیلے سمندر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ مولوی عبد الحق کا بیان ہے:

"گجرات کا صوبہ ایک زمانے میں بہت وسیع تھا اور جودھپور سے لے کر مالابار تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں تقریباً ستر بندرگاہ تھے ان میں سورت بہت بڑا اور مشہور تھا اور تجارت کا خاص مرکز بن گیا تھا۔ ہندوستان کے مسلمان یہاں جمع ہوتے تھے۔"

[سہ ماہی رسالہ اُردو ص ۴۵۱ جولائی ۱۹۲۸ء]

دراصل اس پورے علاقے میں یہاں کی آب و ہوا اور اس کے خمیر میں آدم کے وجودِ قدسی کی فردوسی مہک اور ان کی بیتابانہ دشت نوردی کا پاکیزہ سکوت، اُن کے لمحۂ اولیں کی تنہائی کی معصومیت شامل ہے جو زمین میں ان کی سرگردانی آج بھی دادِ آبلہ پائی دیتی نظر آتی ہے۔ جب پہلے پہل اس ویرانے

کی زندگی ... علم و فضل کی دولت و ولایتِ کبریٰ کی نعمت سے سرفراز ... ۳۶ سال ...

میں وصالِ محبوب کی تڑپ کے ساتھ اتارے گئے اور چند ساعتیں بڑی بے صبری سے تنہا بسر کیں تو غمِ ہجر سے جھلسی پلکیں آنسوؤں کے سیلاب کو دیر تک روکے نہ رہ سکیں، خشک و ناطرمت خاک کے ذروں نے جلیشیں اپنے دامن میں جذب کر لیا تو یہ زمین چشمِ یزداں کی توجہ کا باعث اور قدسیانِ فلک کی نظروں میں محترم ہو گئی۔

حضرت قدس سرہٗ کا بچپن یکسر صحنِ تنہائی میں گزرا کہ الولد سر لابیہ کی سنت ترکہ ہونے پائے۔ کم سنی کے اس دور میں آپ اپنی فطرتِ سلیم و عاداتِ کریمہ کے باعث کھیل کود و لہو و لعب کی محفلوں سے ہمیشہ محترز رہے۔ شعور و فکر کی عمر کو پہنچے تو وقت کے قابل اساتذہ و فاضل علما سے ابتدائی تعلیم حاصل کر کے فائز المرام ہوئے تکمیلِ نصابِ علمیہ مروجہ و تحصیلِ علومِ عقلیہ و نقلیہ کے بعد اپنے والدِ محترم سیدی شاہ ابراہیم منظرِ جمال اللہ قدس سرہٗ سے تزکیۂ النفس اور تجلیۂ قلب کی تربیت پائی اور اشغالِ باطنی کے استفاضہ کے بعد مجاہداتِ شب و روز سے "تصور و تصدیق" کی مشق کر کے کامل ہوئے۔ مزید تکمیلِ مراحلِ سیر الوجود و ترحیلِ منازلِ عالمِ شہود کے بعد خرقۂ خلافت پہنا۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری تذکرۂ اولیائے دکن صفحہ ۴۹ پر لکھتے ہیں:

"علمائے گجرات کی خدمت میں کتبِ تحصیلی سے فراغت پائی اور والد ماجد سے خلافت و اجازت حاصل کی۔"

قدرت کے کبھی نہ ختم ہونے والے خزانۂ علمیہ سے آپ کو دولتِ علم کے علاوہ ذہانت و ذکاوت کی ایسی عظیم و بہتم بالشان قوتِ حافظہ مستقیم بھی ملی تھی کہ آپ کے سامنے مشاہیر علمائے وقت کان پکڑتے تھے۔ آپ کے نوادرِ علمیہ حدِ شمار سے باہر ہیں۔ آپ نے بہت کم عرصہ میں علومِ باطنی، اسرارِ تصوف، نکات و رموز میں ایسی دستگاہ پیدا کر لی تھی کہ طالبانِ حق و ہدایت کے لیے آپ کا وجود اک روشن چراغ تھا۔ جب مسندِ رشد و ہدایت و منصبِ قرب و ولایت پر رونق افروز ہوئے تو کمال آفرینی کے جوہر زبان زدِ عام ہو گئے۔ عرصہ دراز تک پورے یقین و اعتماد سے درس و تدریس

تبلیغ و تلقین کے کام میں فرق نہ آنے دیا۔ تمام عمر اشاعتِ دینِ حنیف میں بسر فرمائی۔

آپ کی ذاتِ مجمعِ کمالات کے فیضان سے بے شمار گم کردۂ راہِ حق و مبتلائے فسق و فجور افراد نے توبہ کی اور اپنے معاصی سے دست بردار، اخلاقِ رذیلہ سے بیزار اور افکارِ فاسدہ و سفیہانہ سے نجات پائی۔ سینکڑوں نے ایمان و یقین کی دولت کو سمیٹ کر اپنی تردامنی کو آپ کے آستانہ کی چوکھٹ پر خشک کر لیا اور ساری عمر نفس کے جبر اور برح کے کستکراہ سے بچے رہے۔ ہزاروں نے آپ کے دامن سے بندھ جانے میں اپنی عافیت سمجھی۔ لاکھوں نے مقاماتِ علم و عرفان طے کیے۔ عبدالجبار خاں ملکاپوری نے تذکرۂ اولیائے دکن میں لکھا ہے:

> "طالبین و مریدین آپ کے فیضِ صحبت سے مراتبِ اقصیٰ و مدارجِ اعلیٰ کو پہنچے۔ اہلِ گجرات پر آپ کی تعلیم و ہدایت کا ایسا اثر ہوا کہ گھر گھر مریدی کا سلسلہ جاری ہوا۔" ص ۲۹۱

خصائص و اوصافِ حمیدہ

حضرت قدس سرہ کے مکارمِ اخلاق، خصائلِ کریمہ و شمائلِ فخیمہ کی سطح بہت اونچی تھی۔ وہ اپنے جدِ اعلیٰ سیدنا سلطان الواصلین سید احمد کبیر الرفاعی رضی اللہ عنہ کی جیتی جاگتی منہ بولتی تصویر تھے۔ قناعت پسندی و فقیرانہ شانِ بے نیازی آپ کی ایک ایک ادا سے جھلکتی تھی۔ بذل و عطا، عفو و درگزر، جود و سخا میں کوئی آپ کا ہمسر نہ تھا۔ کشادہ دست و حشیم بزرگ تھے۔ دور دور سے لوگ منزل و مسافت کا خیال فراموش کر کے آپ کے در فیض گہر تک آستاں بوسی کے لیے پہنچ جاتے۔ غرض مندوں کو بے حساب اور غیرت مندوں کو بے طلب عطا فرماتے۔ آپ کے جوار میں جو بھی پہنچ جاتا آپ بہ نفسِ نفیس اس کی ہر طرح آسائش، کھانا پانی، رہن سہن کی خود نگرانی فرماتے۔ حیا و حلم و ورع و تقویٰ کے کسی پہلو کو لیجیے آپ کی شخصیت تنہا نظر آئے گی۔ جو کوئی

ایک روایت میں آیا ہے کہ [illegible] سید حسن [illegible] سلطان [illegible] آپ کی [illegible] سلطان [illegible] [illegible]

آپ سے ایکمرتبہ مل لیتا اُس سے آپ کی ملاقات کے لمحات فراموش نہ ہوتے۔ لوگ آپ سے تسکینِ قلب و تمزینِ علم و ادب پاکر سرخرُو و کامیاب ہوتے۔ جہاں دیدہ نگاہیں کہہ اُٹھتیں کہ اگر کوئی اس زمانے میں سیدی احمد کبیر رفاعی رضی اللہ عنہ کے اوصافِ عالیہ و صفاتِ قدسیہ کو دیکھنا چاہے تو وہ حضرت سیدی شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کو دیکھ لے۔ آپ کی اس ہم شکل و متشابہ صفات کے باعث آپ کا خصوصی وجزوِ اسم لقب "معشوق اللہ" آپ کے جد کے لقب پر ہی آپ کو ملا۔ آپ کی منکسر المزاجی، نفس کشی اور شانِ تواضع کے باعث آپ کا آستانہ ہمیشہ متوسلین سے آباد رہتا۔ استغنا کا یہ عالم کہ خود بھوکے رہتے دوسروں کو کھلاتے۔ آپ کے دسترخوانِ کرم کی نمک خواری سے ہر زبان آشنا اور ہر فرد رطب اللسان تھا۔ نجیب اشرف ندوی اپنے مضمون مشمولہ علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو ص ۱۰۹ پر رکھتے ہیں:

> "شاہ صاحب کی شہرت بہت عام تھی۔ باہر سے جو بھی بزرگ آتے وہ اُن کے یہاں قیام فرماتے۔"

محمود شیرانی کا بیان ہے:

> "جب شیخ بہاؤالدین برناوی گجرات تشریف لے جاتے ہیں، احمد آباد میں شاہ علی جیو کے مہمان ٹھہرتے ہیں۔" (مقالات جلد اول ص ۱۷۸)

مہمان نوازی کا انتظام ہو کہ غربا پروری کا اہتمام، معاملاتِ دینی ہوں کہ مناسباتِ دنیوی، آپ کا سماجی و معاشی تعلق حد درجہ متوازن و عام تھا۔ ہر ایک سے محبت آمیز برتاؤ فرماتے۔ آپ کے مراسم اپنے ہم وطنوں سے بھی اتنے ہی قریب تھے جتنے آپ کے ہم نشینوں سے۔ ہم سایہ ہو کہ ہم رشتہ بلا فرق مراتب سب سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ اخلاقِ عظیمہ کے جس پہلو پر نظر ڈالیے تخلق باخلاق اللہ کا نمونہ نظر آئے گا۔ آپ سراپا عجز و انکسار تو تھے ہی تواضع و ایثار کا بھی شاہکارِ قدرت تھے۔ آپ کو مخلوقِ خدا

سے ایسی ہی محبت تھی جیسی ماں کو اپنے بچے سے ہوتی ہے نجیب اشرف ندوی کا بیان ہے کہ

"شاہ صاحب سراپا عشق و محبت تھے"۔ ؎۱

خداوندِ قدوس نے آپ کے فقیرانہ وصف میں شانِ استغناء کا جو عنصر شامل فرمایا تھا اس کی تمکنت درس کے وقار میں کبھی ناہمواری و کمی دیکھی نہیں گئی۔ روزِ اول سے جن معمولات کی پابندی لازم کرلی تھی آخر وقت تک ترک نہ فرمائے نوافل و مستحبات فرائض و سنن کی بہ پابندیٔ اوقات مداومت رکھی۔ کبھی کسی سے اپنی کسی ضرورت کا اظہار نہیں فرمایا اور نہ کبھی بھولے سے بھی کسی کی دل شکنی کی۔ درس و تدریس ہو کر فرصت و تفکر کے لمحات بلا ضرورت کبھی کسی سے کلام نہیں فرماتے۔ آپ کی ذاتِ بابرکات سرحانہ سے فائق الاقران تھی۔ کیا توکّل و تقویٰ اور کیا زہد و استغنا آپ صفاتِ قدوسی کے نقشِ ہمہ رنگ تھے دکھاوا، شہرت، ریا، ظاہرداری کی علت سے بچنے کے لیے خود کو ساری عمر زمرۂ علما سے جدا و علاحدہ رکھا، اگرچہ تشنہ لبانِ علم آپ کے قلزمِ علم کی ایک ایک بوند کے لیے ہمیشہ لب کُشا اور لوگ لب بستے رہتے جب یہ علما جاتی تو سیر ہو کر اٹھتے۔

آپ کو گجرات سے والہانہ محبت تھی اور اس پر کسی کی نکتہ چینی و تنقید آپ کو گوارہ نہ ہوتی۔ اگرچہ آپ اپنی اس ناگواری و خفگی کا اظہار اپنے کسی قول و فعل سے ہرگز نہ ہونے دیتے کہا جاتا ہے کہ

"جس طرح مالک اپنے مِلک کی حفاظت کرتا ہے اسی طرح آپ بھی گجرات کی حفاظت فرماتے تھے"۔ ؎۲

ازدواج

یہ بتانا بڑا مشکل ہے کہ آپ نے کس سنہ میں عقدِ نکاح فرمایا تھا۔ عبداللہ میاں رفاعی العمودی سجادہ نشیں کی دی ہوئی معلومات کی روشنی میں حضرت قدس سرہٗ نے بہ عمر تیس سال خاندانِ عیدالروسیہ

؎۱ علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۱۰۹

؎۲ تاریخ اولیائے دکن عبدالجبار خاں ملکاپوری ص ۱۹۰

کی نہایت پرہیزگار، عابدہ، زاہدہ و عفیفۂ دہر خاتون حضرت بی بی سیدہ ام سلمیٰ قدس سرہا سے عقدِ نکاح فرمایا تھا بتاریخ ۱۱ ربیع الاول ۱۱۲۵ھ؁۔ آپ کا سلسلۂ نسب یوں ہے:

"سید محمد عیدالروس بن سید احمد عیدالروس بن سید شیخ عیدالروس
بن سید عبداللہ عیدالروس بن سید شیخ عیدالروس بن ابوبکر سکران
بن عبدالرحمان سقاف بن محمد مولیٰ الدویلہ بن علی بن علوی بن فقیہ
المقدم بن علی بن محمد صاحب المرباط بن علی خالع قسم بن علوی
بن محمد بن علوی بن عبیداللہ بن المہاجر بن عیسیٰ بن محمد
بن علی العریضی بن امام جعفر الصادق رضی اللہ عنہ الیٰ آخرہ"

آپ کے خلفاء و جانشین

حضرت محمد عبداللہ میاں عمودی الرفاعی سجادہ درگاہ حضرت گاؤدھنی کی فراہم کردہ معلومات کی بنا پر حضرت سید شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کے کوئی نرینہ اولاد ہی نہیں تھی۔ خاندانی ملفوظات میں ہے کہ جس زمانے میں شیخ احمد بن حسن العمودی قدس سرہٗ عراق سے ہجرت کر کے گجرات کی سیاحت کا ارادہ کر کے احمدآباد میں قیام فرمایا تو حضرت سیدہ شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کے خصوصی مہمان رہے۔ دونوں میں باہم تبادلہ خیالات ہوتے تھے۔ چونکہ حضرت شیخ احمد بن حسن العمودی قدس سرہٗ، بانیِ خاندان و سلسلہ عمودیہ کے جدِ اعلیٰ شیخ سعید بن عیسیٰ العمودی قدس سرہٗ کی اولادِ اطہار سے ہیں اور انھیں چاروں سلاسلِ عالیہ "قادریہ، رفاعیہ، مغربیہ، عمودیہ" میں خلافت و نعمت حاصل تھی اور سلسلۂ عالیہ قادریہ میں سات واسطوں سے سلسلۂ رفاعیہ میں پانچ واسطوں سے خصوصی نعمت آپ کو حاصل تھی اس لیے حضرت سید شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ نے اپنے

مہمان کی خوبیوں وصلاحیتوں کو جان کر انھیں بعد تکمیلِ مراتبِ ستہ خلافت و نیابت سے مشرف فرمایا۔
شیخ احمد بن حسن العمودی قدس سرہ کے جدِ اعلیٰ سیدی شیخ سعید بن عیسیٰ العمودی قدس سرہ کے بارے میں تذکروں میں لکھا ہے کہ آپ شکمِ مادری ہی میں درجۂ ولایت پر فائز تھے۔ آپ نے قاعدے کے مطابق نہ تو علمِ دین ہی سیکھا اور نہ ہی علمِ عرفان کے حصول کیلئے کسی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ باوجود پڑھے لکھے نہ ہونے کے اپنے معاصرین علما کو دینی مسائل میں مشورہ دیتے۔ ظاہری و باطنی دونوں ہی طرح کے علوم پر آپ کو معاصر علماء میں فوقیت حاصل تھی۔ آپ لفظی ستائش و شہرتِ دنیوی سے متنفر تھے۔ قرآن کسی سے پڑھا نہ تھا مگر کسی کو غلط پڑھتے دیکھ لیتے تو فوراً ٹوک دیتے اور خود درست قرأت کر کے صحیح قرآن پڑھنے کی ہدایت کرتے۔ قرآن کی کوئی سورت ہو کہ آیت خفیفہ آپ اس کا مقام اور منزل ایسا بتا دیتے کہ حفاظ بھی اسقدر جلد بتانے پر قادر نہ ہوتے بلکہ آپ کے حفظِ قرآنی کا انداز دیکھ کر حفاظ کان پکڑتے۔ آپ بے حد نمازگزار، عابد، زاہد و متقی و پرہیزگار مردِ کامل تھے۔ آپ کی کثرتِ نمازگزاری دیکھ کر لوگوں نے آپ کو عماد الدین کے لقب سے ملقب کیا لیکن یہی لقب کثرتِ استعمال کے باعث "عمودی" ہوگیا۔ یہی آپ سلسلۂ "عمودیہ" کی بنیاد بن کر شہرت پاگیا۔
آپ نے اپنے پوتے حضرت شیخ احمد بن حسن العمودی کو ہندوستان ہجرت کر جانے کی ہدایت کی تھی اس ہدایت و اشارے کو پاکر آپ کے پوتے شیخ احمد بن حسن معہ چند مریدوں کے ۹۳۷ھ میں ساحلِ گجرات پر آئے اور کچھ دنوں بعد حضرت شاہ علی جیوگاؤں دھنی قدس سرہ کے مہمان رہ کر عرصۂ دراز تک ستفید ہوتے رہے یہیں دورانِ قیامِ احمدآباد شیخ احمد بن حسن العمودی کے ہاں شیخ عبدالقادر قدس سرہ کی ولادت ہوئی۔ اس بابرکت نومولود کو دیکھ کر حضرت شاہ علی جیوگاؤں دھنی نے مسرت کا اظہار فرمایا اور ... فرمایا۔ شجرہ العمودیہ میں آپ کے بارے میں یہ عبارت درج ملتی ہے "شیخ عبدالقادر العمودی خلیفہ متبنیٰ و صاحب سجادہ شاہ علی جیو گاؤں دھنی ..."

[illegible] مقالہ ... صفحہ ۳۳۰ ... بحوالہ ...

حضرت سید شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ نے اپنی توجہ اور شفقت و محبت سے شاہ عبدالقادر کی ظاہری و باطنی پرورش فرمائی۔ شب و روز کمال زہد و اتقا سے شیخ عبدالقادر نے بھی عرفان الٰہی حاصل فرمایا تحصیل علم و تکمیل مراتب رفاعیہ کے بعد حضرت قدس سرہٗ نے آپ کو دستار فضیلت و خرقۂ خلافت سے سرفراز فرما کر اپنی بہت سی چیزیں جیسے تسبیح، مصلیٰ، علم جو سنہ ۹۱۴ھ کا بنا ہوا ہے عطا فرمائیں[1]۔

حضرت قدس سرہٗ کے بہت کم خلفا کے اسما شجرات میں ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی بتائی جاتی ہے کہ آپ کا جو بھی مرید[2] ہوتا وہ خدا شناسی کے رمز اور خدا ترسی کے جوہر سے آراستہ ہو کر مدارج قرب و اتصال سے مشرف ہو جاتا تھا۔ آپ کے جن قابل ذکر خلفا کے نام مشہور زمانہ ہیں ان میں ایک سید عبدالقادر العمودی ہیں جنہیں خلافت بھی ملی اور سجادہ نشینی بھی اور انہی کی اولاد اطہار میں آج تک سجادہ نشینی چلی آ رہی ہے اور دوسرے سید مصطفےٰ حبیب اللہ ہیں۔

سیدی شاہ مصطفےٰ حبیب اللہ نے عطائے خلافت و اجازت کے بعد مضافات احمد آباد میں مسلک رفاعیہ کی ترویج و اشاعت کا اہم ترین فریضہ انجام دیا۔ آپ کی تلقین و تعلیم سے بے شمار افراد داخل سلسلہ ہو کر انعامات الٰہی کے اہل ہوئے کئی اپنے صاحب صفا و تقویٰ، برگزیدہ عالم ہو کر مخلوق خدا کو راہ راست پر لانے کا کام انجام دیا۔ انہی میں آپ کے بھی دو خلفا نے بڑا نام کمایا۔ ایک سیدی ابراہیم عبداللہ ہیں جنہوں نے دیوان شاہ علی جیو گاؤں دھنی کو دوسری مرتبہ تفصیلی دیباچے کے ساتھ مرتب کیا تھا انہی کو عام طور پر محققین کرام نے حضرت شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کا پوتا سمجھا اور اس مغالطے کی بڑی وجہ ناموں کے ساتھ ابن لکھ جانے سے ہوئی ہے۔ شجرات طریقت میں عموماً "خلیفہ" کے لفظ کی صراحت نام کے ساتھ کبھی نہیں کی جاتی کہ اس میں غیریت و دوئی کا تصور پیدا ہو جاتا ہے جبکہ ابن سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی یعنے وہی وہ ہے جو جیسا کچھ تھا اسی بات کو شارع علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ولد سر لابیہ میں ظاہر فرمایا تھا۔ جسے عرفائے

[1] علم کی تصاویر میں دیکھا جا سکتا ہے

[2] مرید کے معنی لغت میں ارادہ کرنے والے کے ہیں لیکن اصطلاحاً پیر سے ارادت رکھ کر اپنے اور ہر طرح کی ساری صلاحیتوں اور قوتوں کو اپنے پیر میں محو کر دینے والے کو مرید کہا جاتا ہے۔

اپنے آپ میں اپنے پیر کا حقیقی بھید پاکر جس بات کی تکمیل پیر کے قول و فعل میں ہونے سے رہ گئی تھی اب اس کی تکمیل اس کے قول و فعل سے ہونے لگی اسی باعث وہ ابن کہلایا۔ جس طرح کہ کہا جاتا ہے باپ کے تحت شعور میں اگر شاعر بننے کا جذبہ موجود تھا لیکن حالات اور مواقع فراہم نہ ہونے کی وجہ وہ اپنے اس جذبے کو پروان نہ چڑھا سکا تو یہی جذبہ اس کی کسی اولاد میں منتقل ہو کر اس کی عملی صورت گری کرتا ہے۔ یہی مفہوم ہے "الولد سر لابیہ" کا۔

سید شاہ مصطفے حبیب اللہ کے دوسرے خلیفہ کا نام سید عبدالقادر زنادر اللہ المشہور بہ شاہ علی ثانی ہے[۱] سید شاہ مصطفے حبیب اللہ سے خلافت کا سلسلہ یوں چلا ہے۔ سید شاہ مصطفے حبیب اللہ ← سید ابراہیم عباد اللہ ← سید غیاث الدین کنز معرفت اللہ ← سید علی جیو محبوب اللہ ← شیخ محمد عمودی الزواعی الی آخرہ۔[۲]

عبدالجبار خاں ملکاپوری نے سید مصطفے حبیب اللہ کے بارے میں اپنی معلومات کا جائزہ یوں لیا ہے۔

> "سید مصطفےٰ آپ کے صاحبزادے سجادہ نشین ہوے۔ آپ والد ماجد کے
> ہم قدم تھے اور بزرگانِ سلف کے طریقے پر صاحب کرامت و ولایت
> تھے۔ واقفِ حقیقت و معرفت تھے"۔[۲]

مندرجہ بالا بیان کا کوئی ثبوت نہ شجرۂ طریقت و خاندانی مملوکہ سجادہ صاحب روضہ گاول دھنی سے ملتا ہے اور نہ آج تک وہاں کے سابقہ و موجودہ سجادہ نشین حضرات کے سلسلہ بہ سلسلہ جانشین ہونے کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ روضہ گاول دھنی کے سارے سجادگان سلسلۂ عمودیہ الزاعیہ ہیں۔ جبکہ سید مصطفے حبیب اللہ کا تعلق سلسلۂ عمودیہ سے نہیں ہے نصیر الدین ہاشمی کا بیان ہے "

> آپ کے پوتے شاہ ابراہیم ابن شاہ مصطفے"۔[۳]

علی شیر قانع حالاتِ شاہ علی جی زنادر اللہ کے ضمن میں لکھتا ہے:

> "شاہ علی جی زنادر اللہ مسمی بہ سید عبدالقادر بن سید مصطفے ابن سید علی جی گامدھنی رح

---

[۱] شجرۂ مخزونہ سجادہ روضہ
[۲] تفتیش بحر عمودیہ میں دی گئی
[۳] تذکرہ اولیاء دکن ص ۲۹۲
[۴] اردو مخطوطات جلد دوم ص ۱۸۲

قبرِ ایشاں درہماں مقبرہ واقع است" [1]

مرآۃ احمدی کا مصنف لکھتا ہے:

"His name is Syyid Abdul Quadir son of Shah Syyid Mustufa son of Shah Ali Ji Kanudhani. He is burried in the above Musolem His anniversary celebrated 17 Safar." [2]

نجیب اشرف ندوی رقمطراز ہیں:

"شاہ صاحب کے صاحبزادے کا نام سید شاہ مصطفٰے حبیب اللہ تھا۔ ان کے دو اور صاحبزادوں کا حال معلوم ہے سید عبدالقادر شاہ علی جیو نا در اللہ اور جواہر اسرار اللہ کے دوسرے مرتب شاہ ابراہیم معرفت اللہ" [3]

پروفیسر محمود شیرانی کا خیال ہے:

"مصنف کے نبیرہ سید ابراہیم ابن شاہ مصطفٰے حبیب اللہ ابنِ شاہ علی محمد ہیں۔ جو آپ کے مرید بھی ہیں" [4]

ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور ڈاکٹر جمیل جالبی کا بیان ہے:

ان کے پوتے سید ابراہیم ولد ابن شاہ مصطفٰے" [5]

ظہیرالدین مدنی کا بیان ہے:

"نبیرہ سید ابراہیم ابنِ شاہ مصطفٰے حبیب اللہ ابنِ شاہ علی محمد" [6]

[1] تحفۃ الکرام جلد اول صفحہ ۱۲۳

[2] Supplement to Mirrat-e-Ahmedi page 64

[3] علی گڑھ تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۰۸

[4] مقالات جلد اول صفحہ ۱۸۰

[5] اردو شہ پارے جلد اول صفحہ ۱۴۱ / تاریخ ادب اردو جلد اول صفحہ ۱۱۵

[6] سخنوران گجرات صفحہ ۵۹

مندرجہ بالا تمام بیانات تحقیق سے ساقط ہیں۔ ملفوظاتِ خاندانی اور شجراتِ مخزونہ سجادہ صاحب روضہ گاؤں دھنی رحمتہ اللہ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ آپ نے کوئی فرزند اپنے عقب میں چھوڑا تھا۔ درگاہ حضرت گاؤں دھنی قدس سرہٗ کے موجودہ سجادہ صاحب اولادِ سلسلۂ عمودیہ سے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ سلسلۂ عالیہ رفاعیہ کی عظمت و برتری کے ہوتے ہوئے سجادہ صاحب درگاہ گاؤں دھنی اپنے نام کے ساتھ عمودی لکھ کر اپنے عمودی ہونے کا بھی ثبوت دیں۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ حضرت سیدی شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کے کوئی صُلبی اولاد نہیں تھی۔ خلفا سے آپ کا سلسلہ جاری ہے

وصال و مزار

حضرت سیدی شاہ علی جیو گاؤں دھنی قدس سرہٗ کا وصال ۱۴ ربیع جمادی الاول ۹۷۳ ہجری مطابق ۱۰ دسمبر ۱۵۶۵ء میں ہوا۔ تذکروں اور تاریخ ادبِ اردو میں آپ کے وصال کی تاریخ و سن میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مجمع الانساب میں لکھا ہے:

"سید شاہ علی جیو گاؤں دھنیؒ وفات سنہ ۹۷۰ مزار احمد آباد گجرات"[۱]

غوثی منڈوی کا بیان ہے:

"در سال نہصد و ہفتاد تماشائی لطائفِ روحانی گلشن عزم بدر رود"[۲]

محمود شیرانی لکھتے ہیں:

(شاہ صاحب) "۱۴ جمادی الاول ۹۷۳ھ کو وفات پاتے ہیں"[۳]

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے لکھا ہے:

"وہ ۱۵۶۵ء میں فوت ہوئے اور رائے کھڑ احمد آباد میں دفن کیے گئے"[۴]

۱ ص صفحہ ۱۱۶
۲ گلزار ابرار (فارسی قلمی) ورق ۹۹ (مخطوطہ)
۳ مقالات جلد اول ص ۱۷۸
۴ اردو شہ پارے جلد اول ص ۱۴

نجیب اشرف ندوی رقمطراز ہیں :

"شاہ علی جیو کا وصال ۷۰ سال کی عمر میں ۱۴ رجمادی الاول ۹۷۳ھ م
۱۷ ردسمبر ۱۵۶۵ء میں ہوا۔ "نور اوج بہشت" سن وصال ہے"[۱]

محمد نجیب قادری ناگوری فرماتے ہیں :

"وصال حضرت شاہ علی جیو گاؤں دھنی گجراتی قدس سرہ العزیز ۹۷۳ھ"[۲]

شیخ شرف الدین نے تحریر کیا ہے :

"دوم جمادی الاول = شاہ علی جیو گاؤں دھنی گجراتی درسال نہصد
و ہفتاد و سہ"[۳]

... الدین گلشن آبادی نے ذکر کیا ہے :

"وفات آپ کی بقول صاحب گلزار ابرار سنہ ۹۷۳ھ میں واقع ہوئی"[۴]

ظہیر الدین مدنی کا بیان ہے :

"موصوف نے ۷۰ سال کی عمر میں بتاریخ ۱۴ رجمادی الاول ۹۷۳ھ
میں انتقال کیا"[۵]

ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے :

"گام دھنی کا انتقال سنہ ۹۷۳ھ / ۱۵۶۵ء میں ہوا"[۶]

نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں :

"سنہ ۹۷۳ھ میں شاہ صاحب کا انتقال ہوا"[۷]

علی حیدر قانع نے یادداشت لکھی :

---

۱ علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص ۱۰۹

۲ کتاب الاعراس ص ۹۰

۳ مخزن الاسرار (مخطوطہ) مخزونہ سالار جنگ میوزیم

۴ تاریخ الاولیا

۵ ... مخطوطات گجرات

۶ تاریخ ادب اردو جلد اول ص ۱۱۹

۷ اردو مخطوطات جلد دوم ص ۱۸۳

"ایشان چہاردہم شہر جمادی الاول سال نہصد و ہفتاد و سہ رحلت مقرر
است ، مدت عمر او ہفتاد و ہفت سال "[۱]

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا کہنا ہے :

"شاہ صاحب کا انتقال سنہ ۹۷۳ھ میں ہوا "[۲]

عبدالجبار خاں نکاپوری فرماتے ہیں :

"آخر آپنے ۱۴ جمادی الاول سنہ ۹۷۳ھ کو نوسو تہتر ہجری میں اس
دار فانی سے عالم جاودانی کو رحلت کی ـــــ آپ کی عمر ۷۷
سال تھی "[۳]

حکیم مولوی عبدالحی نے غالباً قیاس سے کام لے کر آپ کا سن وصال سب سے جدا و غلط لکھدیا ہے ۔

"ایک اور بزرگ سید علی بن ابراہیم رفاعی تھے ان کا قیام بھی احمد آباد
میں تھا ۔ وفات سنہ ۹۹۳ھ میں ہوئی "[۴]

مراۃ احمدی لکھتا ہے :

"Grandson of Syyid Abdur Rahim.
He compose hymes in HINDI. His
Diwan is like the Diwan of Maghr-
abi in tone & sprit. His tomb is
situated by the side of Shah Ghazni.
He lived to age of the 77 years and

[۱] تحفۃ الکرام جلد اول ص ۴۱
[۲] [illegible] اردو ۱۹۲۸ء
[۳] تذکرہ اولیائے دکن ص ۹۴۸
[۴] یاد ایام تاریخ گجرات ص ۲۶ مطبوعہ ۱۹۲۰ء

died in 973 A.H.. His anniver
sary 14th Jamadil Awwal." ¹

آپکے آستانے کی جبین پر یہ تحریر کندہ ہے :

" حضرت شاہ علی جی گامدھنی معشوق اللہ الرفاعی ابن سید ابراہیم مظہر اللہ الرفاعی المتوفی
۱۸ صفر ۹۷۰ھ "

مندرجہ بالا تمام بیانات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سوائے دو چار مولفین کے تقریباً
سبھی محقق حضرت قدس سرہٗ کے سن وصال ۹۷۳ھ پر متفق ہیں شجرۃ الاحمدیہ جو حضرت سیدی شاہ عبدالرحیم رفاعی
ثانی متوفی ۱۱۳۲ھ کی تصنیف ہے اوروں کی بہ نسبت ان کا بیان زیادہ قوی، درست و صحیح کہا جا سکتا ہے
اور یوں بھی اپنے خاندان کے حالات کا صحیح علم صاحبِ خاندان کو زیادہ ہوتا ہے اور وہی سب سے زیادہ معتبر
بہتر بات اپنے احداد و اسلاف کے بارے میں کہہ سکتا ہے، میری تحقیق کا بیشتر مواد و ماخذ چونکہ یہی کتاب
شجرۃ الاحمدیہ ہے اس لیے میں اسے بطور دلیل نقل کرتا ہوں۔

" و توفی فی رابع عشر من شہر جمادی الاول سنہ
ثلث وسبعین وتسعمایۃ من الهجرۃ " ²

عبدالجبار خاں ملکاپوری، علی شیر قانع اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے حضرت قدس سرہٗ کی عمر ۷۷ سال بتائی
ہے اور ان کی اتباع میں تحقیق کیے بغیر ہی ظہیرالدین مدنی نے یہی عمر اپنی کتاب سخنورانِ گجرات میں درج کر دی چونکہ
ملفوظات مرتبہ شیخ عبدالرحمان الفاروقی الاحمدیؒ میں آپ کی ولادت کا سن ۸۹۹ھ اور تاریخِ وصال ۹۷۳ھ
درج ہے نوسوتہتر میں سے آٹھ سو ننانوے خارج کر دینے پر ۷۴ حاصل ہوتے ہیں! اگرچہ اسی ملفوظات
کے صفحہ ۲۵ پر آپ کی عمرِ قیام دارِ فانی کے ضمن میں ایک جملہ اس طرح لکھا ہوا ملتا ہے۔

---

1. A supplement to Mirrat-e-Ahmedi p: 64

2. مخطوطہ موجود سجادہ حجرہ، صفحہ ۱۵

"و عمر حضرت شاہ علی محمد ہفتاد و پنج سال شود"۔ ؎

نیز اس ملفوظات کے صفحہ ۲۶ پر آپ کا سنِ وصال یوں لکھا ہوا ہے :

"تاریخِ وصال حضرتِ مقدسہ در دُہرہ گوجری' بعد نہصد و ہفتاد و دو سال" ؎

شاہ علی مرشد احد ہے اس بن دوجا کوئی ناہیں کلام سنتیں کھو کر جاؤ پیو کی نینوں دیکھو سائیں

نیز ایضاً "تاریخِ رحلت شدن" کے عنوان کے تحت حسبِ ذیل نظم اور قطعات درج ہیں :

شنیدم رحلت شد آلِ طٰہٰ ٭ نبیرہ سیدی سلطانِ احمدؒ
شہ کونین غوثِ دین و دنیا ٭ کہ بودش واقفِ اسرارِ امجد
رسول اللہ بدے خرقہ عطا کرد ٭ بحکمِ ایزد و بیچوں و بے حد
چو کردم فکرِ تاریخِ وصالش ٭ خرد گفتا "حبیب از فیضِ احمد" ۹۷۳

حضرت سیدی شاہ علی جیو گام دھنی قدس سرہ کے ایک مرید حضرت صالح محمد بن شیر محمد احمدیؒ نے آپ کے سانحۂ ارتحال پر یہ نظم قلمبند کی :

حمد سے بر آں دم بر زبان مرشاہ شاہی اکبر است
ہم حیات و ہم ممات و قدرتش فاضل تر است
گویم درود بعد از آں بر روحِ شاہِ انبیاءؐ
کز نورِ شاں مظہر ہمہ لولاک حیدر بر سر است
دادہ بہ سلطان سیدی احمد کبیر امتش
از ابتدا خیر البشر فرمودہ شد آں مشہر است

؎ ملفوظ طرزِ خورد، سجادۂ جیو، گاؤں دھنی احمد آباد

در آں آں شمس الضحیٰ بودند سلطان عارفین
شاہ علی از فیض او مرشد بدے کامل تراست
شہر جمادی الاولیٰ ہفتاد و سہ نہصد سنہ
از بعد ہجرت مصطفےٰ رحلت مسطراست
ماہی منور در جہاں تا بود روزے چہاردہ
از پانزدہ پس پردہ وآں روشن بدر رہبر است
فیضش نگردد منقطع از کرم حق سُبحانہٗ
چوں قطب ثابت انجمی باشند یک یک گوہراست

آپ کی درگاہ کی چوکھٹ کے کتبے پر جو تاریخِ وصال درج ہے اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کسی انگریز نے اسے کندہ کروا کر لگوایا تھا۔ اسی تاریخِ وصال کو درست قرار دے کر آپ کا عرسِ مبارک ہر سال احمد آباد میں ۲۷ صفر المظفر کو ہی کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ معتبر روایات اور تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ آپ کا وصال ۱۴ر جمادی الاول ۹۷۳ھ ہی کو ہوا۔ عرس کی یہ تاریخ دراصل شاہ علی جیو نادر اللہ عرف میاں جی کے تاریخِ وصال سے بدل گئی ہے۔ تحقیق کیے بغیر نام کی یکسانیت کے باعث مورخین و مولفین نے شاہ علی جیو نادر اللہ کو حضرت شاہ علی جیو گام دھنی سمجھا۔ ڈاکٹر شیخ فرید صاحب[۱] کے موسومہ ایک خط میں ڈاکٹر ضیا الدین ڈیسائی صاحب نے اپنے اس شبہ کا اظہار یوں کیا ہے:

"شاہ علی جیو گام دھنی اوّل اور ثانی کے بارے میں معلومات درکار ہیں بالخصوص ان کے درمیان رشتہ اور ان کے تاریخہائے وفات، میرے خیال میں اوّل کی تاریخِ وفات ۹۷۱ یا ۹۷۳ھ ان کی نہیں ثانی کی ہے۔"[۲]

۱؎ ڈاکٹر شیخ فرید صاحب، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی۔ بمبئی میں اردو تحقیق کے پیشرو، ان سے بعض امور پر تبادلۂ خیالات کیا تو موصوف نے بعض خط دکھا کر اپنی معلومات سے واقف کرایا۔

۲؎ خط مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۸۹ء

یہ بات قطعی ہے اور اس میں شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ حضرت سیدی شاہ علی جیو گاوں دھنی قدس سرہ ساری دنیا میں واحد و تنہا شخصیت کا نام ہے جن کا لقب "گاوں دھنی" صرف آپ ہی سے خاص ہے۔ آپ سے پہلے اور آپ کے بعد یہ لقب کسی نے اختیار نہیں فرمایا۔ رہا شاہ علی جی ثانی کا معاملہ تو ان کے نام کے ساتھ "نادر اللہ" کا اضافہ خود اس بات کی شہادت ہے کہ انھیں کسی بھی طرح "گاوں دھنی" کے لقب سے کسی نے ملقب نہیں کیا، اور نہ ہی خود انھوں نے "گاوں دھنی" لقب کو اپنے نام کا جزو بنایا۔

آپ کے مشاغلِ قدسیہ و آثارِ متبرکہ

(مرویات)

آپ شب و روز اوقاتِ نمازِ پنجگانہ کے فرائض کی ادائیگی کے بعد کثرت سے نوافل پڑھتے۔ یادِ الٰہی سے آپ کا کوئی لمحہ خالی نہ تھا۔ آپ کوئی کام کرتے ہوتے تب بھی آپ کا قلب اللہ کے ذکر میں جاری رہتا۔ ساری رات نمازِ تہجد تک آپ بیدار رہتے تہجد پڑھ کر تھوڑی استراحت فرماتے بس یہی وقفہ آپ کے شب و روز کی تکان زائل کرنے کے لئے آپ نے اللہ سے مستعار لیا تھا۔ نماز کے لیے ہمیشہ بے چین رہتے خود وقت پر فرض نماز ادا فرماتے اور لوگوں کو بھی موقع بموقع وقت پر نماز پڑھنے کی تلقین فرماتے۔ آپ کی نماز کی ادائیگی کا طریقہ بڑا ہی دلچسپ تھا۔ آپ جب مصلیٰ پر ادائیگی نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو بجائے اِنِّیْ وَجَّھْتُ الخ پڑھنے کے خدائے ذوالجلال سے راست مخاطب ہوتے "اے اللہ کیا تو موجود ہے؟ جواب ملتا موجود ہوں تو پھر اس طرح نیت فرماتے "تو میرے سامنے میں تیرے سامنے اللہ اکبر"۔

ایک مرتبہ لوگوں نے آپ سے فجر کی نماز کی امامت کرنے پر اصرار کیا۔ آپ نے کہا لوگو! مجھے امامت کرنے

کی تکلیف نہ دو، لوگ بے حد مُصر ہوئے۔ چونکہ آپ کسی کا کہا ٹالتے نہ تھے، راضی ہو گئے۔ امامت فرمائی، التحیات پڑھنے بیٹھے تو اسقدر توقف فرمایا کہ سورج ہی نکل آیا اور دھوپ لوگوں پر پھیل گئی۔ تب کچھ دیر بعد آپ نے سلام پھیرا۔ دعا فرما کر اٹھے تو لوگوں نے سبب پوچھا، آپ نے فرمایا میں نے اللہ تبارک و تعالیٰ سے تمام مقتدیوں کی نماز اور تمام کو قبول کر لینے کی درخواست کی جو قبول ہو گئی۔ اس مژدۂ جاں فزا کو سن کر لوگ وجد کرنے لگے۔ جسقدر لوگوں نے اقتدا کی تھی سب کے سب مقرب الٰہ ہوئے اور مراتبِ اعلیٰ کو پہنچ کر برگزیدہ عالم ہوئے۔ اس کے بعد آپ نے لوگوں سے وعدہ لیا کہ وہ پھر کبھی امامت کے لیے اصرار نہ کریں گے۔ کچھ عرصہ بعد جب اور لوگوں کو اس کی اطلاع ہوئی وہ بھی آپ کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے آئے اور اسی طرح کا اصرار فرمایا۔ آپ نے کہا میری امامت میں نماز ادا نہ ہو سکے گی مجھے معاف فرمائیں۔ لوگ نہ مانے، آپ بادلِ ناخواستہ تیار ہوئے اور کہا میں پہلے نمازِ سنت پڑھوں گا آپ حضرات مشاہدہ کرنا کہ میرے کپڑوں پر کسی قسم کا کوئی تغیر تو رونما نہ ہوا ہے۔ اگر ہو تو مجھے امامت سے معذور جان لینا۔ لوگ راضی ہو گئے تو آپ نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپ ہمیشہ سرِ اقدس پر سفید عمامہ باندھا کرتے اور پشت پر اس کا ایک سرا چھوڑ دیتے۔ آپ نے جب نماز شروع فرمائی تو لوگوں نے دیکھا کہ آپ کا عمامہ لہو سے سرخ ہو رہا ہے۔ نماز ختم ہوئی تو لوگوں نے دوسرا عمامہ سر پر باندھا پھر آپ نماز ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ یہ بھی اسی طرح رنگ گیا تو لوگوں نے جانا کہ آپ مرضیِ مولا کے پابند ہیں پھر کبھی اصرار نہ فرمایا۔

نمازِ پنجگانہ کی ادائیگی کے بعد دن بھر آپ کے دستِ مبارک میں تین سو منکوں والی سانپ کی ریڑھ کی ہڈیوں سے بنی تسبیح رہتی جس پر آپ تسخیرِ نفس کے لیے اسماے جلالی کا ورد فرماتے۔ ہزار دانوں والی تسبیح لکڑی کے منکوں کی بنی جسے آپ رات کے اوقات کے وظائف میں استعمال فرماتے۔ یہ اسماے جلالی کے ورد میں کام آتی۔ یہ تبرکات سجادہ صاحب کے پاس آج بھی موجود ہیں تصویر میں ان کے نقوش دیکھے جا سکتے

لہ اسی لیے آپ کی پگڑی کا پلو سرخ رنگ کا اور سارا گنبد سفید رنگ کا ہے۔

ہیں۔

آپ کو فنِ دستکاری میں بھی مہارت حاصل تھی۔ آپ بہترین خوش نویس تھے۔ آپ کے دستِ مبارک کا پنجہ اسلم جسے آپ ہر سال نشانِ غوثِ پاکؓ پر لگوا کر برآمد کرتے آج بھی سجادہ صاحب کے پاس موجود ہے کہا جاتا ہے کہ اسے پانچ دھاتوں سے گوندھ کر بنایا گیا ہے۔ سرکارِ پیرانِ پیر غوث الاعظم دستگیرؓ کے نشانِ مبارک کا کپڑا جو گہرے سیاہ رنگ کا ہے جس پر درمیان میں دائرہ بنا کر ''المدد یا عبدالقادر شئی للہ'' سفید کپڑا کاٹ کر طغرے کی بنائی کی ہے۔ آپ کے دادا حضرت شاہ عمر مظہر رحمۃ اللہ کے دستِ مبارک کا کاڑھا ہوا ہے۔ اسے بھی تصویر میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

آپ کا ذریعہ معاش کاشت کاری تھا۔ اک وسیع زرخیز قطعۂ زمین پر آپ قلبہ رانی فرماتے کبھی کسی مقامی کسان سے قول و قرار پر کاشت کے حصہ دار ہوتے اور کبھی خود تنہا کاشت فرماتے فصل پکنے پر تمام مقامی محتاجوں، ضرورتمندوں، مسافروں اور مہمانوں پر صرف فرماتے کہا جاتا ہے کہ فصل کٹنے سے قبل ہی اس کی بڑی مقدار پرندوں کی غذا بنتی۔ آپ اپنے کھیتوں کے اطراف بڑے بڑے اونچے درخت لگوا رکھے تھے جن پہ پانی کے بڑے بڑے برتن پانی سے بھروا کر آویزاں کر رکھے جاتے تا کہ ان فصلوں سے جب پرندے اپنا رزق پائیں تو پانی بھی پی لیں۔ کہا جاتا ہے کہ فصل کے زمانے میں یہاں ہر رنگ و ہر قسم کے عجیب و غریب پرندے اپنا آب و دانہ حاصل کرنے پہنچ جاتے جو عام طور پر کہیں اور جگہ نظر نہیں آتے۔ حق بات تو یہ ہے کہ آپ اپنے ہر فعل کو اللہ کے اجر کا مستحق بنا لیا کرتے اسے ضائع نہ ہونے دیتے تھے چنانچہ آپ کاشتکاری بھی اسی مقصد کے تحت فرمایا کرتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچے۔ حدیث شریف میں آیا ہے: ''ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مسلم کوئی درخت لگائے اور اس درخت سے کوئی انسان یا جانور کچھ کھائے تو وہ کھانا درخت لگانے والے کے لیے باعثِ اجر ہوگا۔''[1]

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم عن ابی ہریرہ بحوالہ صحیح تاریخ الاسلام و المسلمین مؤلفہ محمود احمد ظفر طبع اول ۱۹۸۶ء

جنّتی دروازہ

آپ کی مسجد سے متصل بجانبِ قبلہ، پتھر کی ایک حسین کمان بنی ہوئی ہے جو سنگ تراشی کا اک بہترین نمونہ ہے۔ یہ کمان مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی کمانوں سے بڑی حد تک مشابہ نظر آتی ہے اس کے بارے میں لوگوں میں مشہور ہے کہ یہ وہی مقام ہے جہاں حضرت قدس سرہ نے حضرت شاہ محمد غوث گوالیری کو سات آسمانوں اور عرشِ اعظم کی سیر کرائی اور مشاہدۂ حق سے سرفراز فرمایا تھا۔ کمان کی دونوں جانب اندرونی حصے پر ستون کی گرہ کے ذرا نیچے "یا اللہ شافی محمد کافی" اُبھرے ہوئے حرفوں میں نقش کیا ہوا ہے۔ یہ فنِ خطاطی کا اک بے حد متاثر کن نمونہ ہے اسے صاف پڑھا جا سکتا ہے۔ یہی طغرٰی اور یہی عبارت آپ کی مہر مبارک میں کھدی تھی جس کے بارے میں محمود شیرانی مرحوم لکھتے ہیں:

"شاہ علی محمد کا نقشِ نگیں "اللہ باقی محمد ساقی" تھا جس کو بہ شکل برگ تنبول کندہ کرایا گیا تھا۔ جب مریدوں کو شجرہ عنایت ہوتا تھا اس پر اس کی مہر لگائی جاتی تھی"۔[۱]

محمود شیرانی مرحوم نے نقشِ نگیں کی عبارت غلط قرأت کی اور اسے ضبطِ تحریر بھی کر دیا۔ یہ عبارت "یا اللہ شافی محمد کافی" ہے اس کی ایک مہر سجادہ صاحب روضۂ گاؤں دھنی کے یہاں محفوظ ہے۔ یہ لکڑی کے ہشت پہلو ٹکڑے پر کھدے ہوئے حرفوں میں ہے۔ جس کے اطراف اوپر کی جانب بسم اللہ الرحمان الرحیم اور نیچے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تحریر ہے درمیان میں ہشت پہلو دائرے میں یا اللہ شافی محمد کافی کھدا ہوا ہے۔ اسے تصویر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

جنتی دروازے سے متعلق ایک روایت یہ ہے کہ مظفر شاہ گجراتی نے اسی مقام پر حضرت قدس سرہ سے معراجِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دلیل پوچھی تھی، جب اسے تشفی ہو گئی تو اس مقام کو بطور یادگار اس نے

[۱] مقالات، جلد اول، ص

ہر قسم کی بلیات سے گزر جانے والا کہ اس کمان میں عام طور پر لوگوں کا یہ اعتقاد ہے محفوظ کر دیا۔ ...

مصیبت، پریشانیوں اور مسائلِ لاینحل سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ ہر سال نویں محرم کے دن فجر کے ساتھ ہی یہاں لوگوں کا ایک بڑا میلا سا لگ جاتا ہے۔ عورتوں اور مردوں کی علحدہ علحدہ طویل قطاریں لگ جاتی ہیں۔ ہر شخص کا یہ یقین ہے کہ اس دن اس دروازے میں سے ہو کر گزر جانا باعثِ نجات اور سال بھر کے لیے عافیت کا سبب ہے۔ عوام میں ایک اور اعتقاد ہے کہ جب کوئی شخص قضائے الٰہی سے مر جائے تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد میت کو اس کمان میں سے لے کر نکلتے ہیں اور پھر قبرستان لے جا کر دفن کرتے ہیں۔ ایسا کرنے سے کہا جاتا ہے کہ مردہ عذابِ قبر سے محفوظ اور اس کے گناہوں میں تخفیف ہو جاتی ہے۔

تصوّف

ہیئتِ اسلامیہ کا ایک اہم ترین موضوع، حکمت واخلاقِ الٰہی کے وقوف اور تمام پوشیدہ نعمتوں اور بیشتر حسنات کا گنجینہ، جس کے بارے میں حکما، ائمہ ومفکرین کے ہزاروں اقوال اور بے شمار افکار اسلامی وغیر اسلامی ادب کے اوراقِ بسیط وکشادہ پر جابجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں اگر صرف ان اقوال وآراء کا استقصا کیا جائے اور اسے مواد وہیئتِ تصوف کے تحت میں یکجا کردیا جائے تو اتنا دیدی کچھ کئی جلدوں کے ہزاروں صفحات کو محیط ہوگا۔ اب مزید کچھ اس بارے میں کہنا گویا کہی ہوئی بات کا اعادہ کرنے کے مترادف ہوگا۔ بزرگوں کا ایک طبقہ جنھیں ایک خاص امتیازی شان حاصل ہے انہی کے اقوال واصابتِ رائے کو الفاظ کا نیا جامہ پہنا کر ان اوراقِ غیر مستحقہ کو آراستہ کرتا ہوں کہ ایسا کرتے ہوئے ان عظیم المناقب حضرات کے نفوسِ قدسیہ کی لسانی سعی درجۂ پیشِ نظر ہے۔

ان صاحبِ علم ویقین نے اپنے مقام وتجربے سے تصوف کی تعریف کی اور اس کی ضرورت کو جتایا اور اہمیت کو دلائلِ علمیہ سے ثابت کیا۔ حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"تصوف نہ رسم ہے نہ علم، اگر رسم ہوتا تو مجاہدے سے، اور اگر علم ہوتا تو تعلیم سے حاصل ہوتا۔ بلکہ تصوف اخلاق ہے۔ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ "اللہ کی عادت سے عادت اختیار کرو، یہی تصوف ہے"۔ [1]

حضرت بایزید بسطامی قدس سرہٗ العزیز سے کسی نے دریافت فرمایا کہ "تصوف کسے کہتے ہیں؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا:

"آرام کو ترک کر کے محنت اختیار کرنے کو تصوف کہتے ہیں"۔ [2]

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ط

[1] تذکرۃ الاولیا جلد اول ص۱۲

[2] تذکرۃ الاولیا جلد دوم ص۲۰۹

"جسے حکمت عطا کی گئی اسے بے شک مالا مال کر دیا گیا"

قدیم لغت نگار ابن درید (م ۳۲۱ھ) حکمت کی تعریف کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

"پند و نصیحت، حسن خلق یا اچھی بات کی ترغیب، بری بات سے روکنا یا اس سے دور رکھنا یا بری چیز سے محفوظ رکھنا حکمت یا حکم ہے"[1]

حضور اکرم رحمت دو جہاں مالک انس و جاں (روحی فداک) صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

الحکمت ضالۃ المومن فاطلبھا ولو کان عند الکافر ط

حکمت مومن کی متاع گمشدہ ہے اسے حاصل کرو خواہ وہ کسی کافر کے پاس ہو۔

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک دعا کے الفاظ جسے قرآن حکیم نے محفوظ کر دیا ہے یہ ہیں:

رب ھب لی حکما و الحقنی بالصالحین ط

اے خدا مجھے حکمت عطا فرما اور صالح لوگوں میں شامل کر (الشعراء آیۃ ۸۳)

گرچہ حکمت کا حاصل کرنا علم دین کی طرح ہر کس و ناکس پر فرض نہیں لیکن اس کی واقفیت سے عقدۂ توحید و عرفان نفس کے راز کی پردہ کشائی آسان ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اسے علم "حقائق الحقیقۃ" کا نام بھی دیا گیا۔ عرفا کی دعا کے الفاظ میں یہ اس طرح آیا ہے۔

ربنا زدنا قوۃ فی محاربۃ النفس و الھوی فی الصف الاول من الدین فاذوا بالحقایق الحقیقۃ ط اے اللہ ہمیں قوت نفس سے جنگ کرتے وقت قوی و زیادہ فرما تاکہ ہمیں صف اول میں شمار کیا جاؤں اور دین کے حقائق الحقیقۃ کا حامل بنوں"

صاحب حکمت وہی ہے جو نفس اور خواہشات نفس سے ہمیشہ برسر پیکار رہتا ہو جب تک ان پر قابو نہ پا لے۔

[1] جمہرۃ اللغۃ ص ۱۸۶ مطبوعہ حیدرآباد دکن

سے واقفیت نہ ہو گی حقائق الحقیقیہ پر پردہ ہی رہے گا نفس کے ظاہر کا نام خواہشات اور خواہشات کے باطن کا نام ہوی ہے ان ہی کے درمیان ایمان ہے۔ مجاہدات و تزکیہ سے ان کے ظاہر و باطن کی شناخت کر لی جاتی ہے۔ کیونکہ نفس کا باطن اک "بھید" ہے وہیں خواہشات کا ظاہر بھی اک راز ہے۔ ڈاکٹر میر ولی الدین نے شیخ الاسلام حضرت ذکریا انصاری قدس سرہٗ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"تصوف وہ علم ہے جس سے نفس کی صفائی، اخلاق کی تعمیر اور
ظاہر و باطن کے احوال کا علم ہوتا ہے۔"

حکمت، تصوف ہی کا مرادف و ہم معنی لفظ ہے۔ یہ اپنے وسیع تر مفہوم کے باعث مختلف علوم کے لیے بھی مستعمل ہے مگر تصوف مذہب کی اک فلسفیانہ اصطلاح ہے اسے محبتِ حکمت بھی کہا گیا ہے ناصرالدین لکھتے ہیں:

"فلسفے کا لفظ یونانی الفاظ سوفیا اور فیلوس سے مشتق ہے جن کے
معنی "محبتِ حکمت" کے ہیں۔"[۱]

تصوف کا مزاج ایسا مطہر و پاکیزہ ہے کہ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کے قلب و نظر میں قساوت و تنگی کبھی نہ ہو اگر وہ ان باتوں کی موجودگی میں اس سے استفادہ کرنے کی کوشش کریگا تو یہ خیالات کا انتشار اور فکر میں اضطراب پیدا کر دیتا ہے۔ حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک مقام پر لکھا ہے۔

"جب میں ان علوم سے فارغ ہو کر صوفیا کے طریقے کی طرف متوجہ ہوا
تو مجھے معلوم ہوا کہ ان کا طریقہ علم و عمل سے تکمیل کو پہنچتا ہے ان کے علم کا
حاصل کرنا نفس کی گھاٹیوں کا قطع کرنا ہے، اخلاق برائیوں اور نا پسندیدہ
صفات سے اپنے آپ کو پاک رکھنا ہے تاکہ اس کے ذریعہ قلب کو غیر اللہ

[۱] فلسفہ کیا ہے، ص ۲۲

سے خالی کیا جا سکے اور اس (قلب) کو فکرِ الٰہی سے آراستہ کیا جا سکے[1]

حقیقی صوفیانہ بصیرت ارادے کی مضبوطی کا نام ہے۔ دورِ نبوت کے بعد مومنانہ زندگی کا سُراغ اور کامل اطمینان و سکون کی پناہ گاہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حیاتِ طیبہ کے ظاہری آخری کچھ ایام تھے جسے صوفیاے کرام نے اپنی ساری زندگی پر محیط فرما لیا تھا۔ اصح السیر میں بحوالہ طبرانی مولانا عبدالرؤف دانا پوری نے لکھا ہے:

> "جب اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰہِ کی سورت نازل ہوئی تو اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امرِ آخرت کے لیے سخت مجاہدہ شروع کر دیا"[2]

بعثت سے قبل بھی آپ اکثر و بیشتر رمضان کے مہینے میں بمقام غارِ حرا معتکف مشغولِ ذکرِ الٰہ رہا کرتے، مولوی عبدالرؤف دانا پوری لکھتے ہیں:

> "آپ پر استغراق اور محویت کا عالم بڑھتا گیا یہاں تک رات کو بھی پہاڑوں کے شعب میں رہ جاتے پھر یہ حالت ہوئی کہ کھانا پینا بھی کم ہو گیا، کھجور یا جو کی روٹی اور ایک کوزہ پانی لے جاتے کبھی غارِ حرا اور کبھی دوسرے غار یا کھوہ میں کئی کئی دن رہ جاتے۔ پھر یہ حالت ہوئی کہ حضرت (سیدہ) خدیجہ رضی اللہ عنہا خود جاتیں اور تلاش کر کے آپ کو روٹی اور پانی پہنچاتیں"[3]

حضور اقدس و اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ، خدمتِ خلق، ایثار و محبت، رافت و احسان، خوش معاملگی جن کا بے مثل نمونہ تھی آپ کی طاہر و پاکیزہ زندگی کی کوئی مثال اور آپ کے جسمِ اطہر بے مثل کی کوئی نظیر نہ آپ کے بعد دنیا نے پیش کی اور نہ آئندہ پیش کر سکے گی اور کر بھی کیسے سکتی ہے کہ خود مشیت نے ہی آپ کی تخلیق کے

[1] القول فی الطریقہ صوفیا ص ۴
[2] ص ۵۲۲
[3] اصح السیر ص ۵۵

اور آپ کے نقش کی تخلیق ہی کو معدوم کر دیا اور ہمیشہ کے لیے اس باب میں اپنے دستِ قدرت کو ساکت کر دیا۔
آپ کی بعثت سے قبل جتنے بھی اولوالعزم پیغمبر و نبی تشریف لائے وہ سب آپ ہی کی صفاتِ عالیہ کا ایک ایک پرتو تھے جس نبی و رسول کو معجزہ عطا ہوا وہ آپ ہی کے معجزات سے تھا۔ آپ کمالاتِ اولین و آخرین کا مجمع تھے تخلیق و تکوین کا ایسا کوئی کمال' اللہ نے باقی رکھا ہی نہیں جو آپ کو عطا نہ کیا ہو۔

حضور سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ والفتح کے نزول کے ساتھ ہی آپ یہ جان گئے تھے کہ اب اس دارِ فانی میں قیام کی مدت کم رہ گئی ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورت کے نزول کے بعد اکیاسی دن تک آپ حیاتِ ظاہری میں رونق افروزِ عالم رہے۔ اس ایام میں بہت مجاہدے فرمائے جب آپ نے رمضان کا مہینہ پایا تو اعتکاف کے معمولاً عرصہ کو دس دن سے بڑھا کر بیس دن کر دیا۔ مواہب لدنیہ میں لکھا ہے :

"حضور کو سب سے پہلے انقضاءِ عمر اور قربتِ اجل کی اطلاع اذا جاء
نصر اللہ والفتح کے نازل ہونے کے بعد ہوئی اس لیے کہ اس سورہ کا مفہوم
یہ تھا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب بلاد پر آپ کو خدا نے فتوحات
عطا کیں اور جس دین کی طرف آپ لوگوں کو بلاتے تھے اس میں
لوگ جوق در جوق داخل ہو گئے تو تبلیغ و رسالت کا مقصد پورا ہو گیا
جس کے لیے آپ دنیا میں بھیجے گئے تھے اب تسبیح و تحمید اور استغفار
کی کثرت سے میری لقا کا سامان کیجیے۔" ۱

صوفیائے کرام کے نزدیک انکی حیات' موت کے بعد کی زندگی کا ہی نمونہ ہے وہ دنیا میں رہ کر بھی دنیا سے دور بے تعلق رہتے ہیں تو اس میں ایسی ہی زندگی کے نقوش ابھر آتے ہیں جو اسباب علل کی اثر پذیری کو قبول نہیں کرتے

۱۔ مواہب اللدنیہ ص ۲۱۳

وہ دنیا میں اسی طرح رہتے ہیں جس طرح مردہ جسم کہ سپردگیِ لحد تک دنیا کے سرد و گرم سے بندھا رہتا ہے پھر ان سے بے نیاز بھی ہوتا ہے۔

خلفائے راشدین کا دور معرکہ حق و باطل کا دور تھا، جب دین ہر طرح مکمل و مستحکم و متعین ہو گیا تو دنیا اس کے سامنے سرنگوں ہو گئی اور اسلام کی حقانیت اور اس کی بزرگی و برتری کو تسلیم کیا یہی بزرگی و برتری جس تقویٰ و پرہیزگاری کے سائے میں پل کر محفوظ ہو گئی تھی، بنو اُمیہ کے ہاتھوں میں پہنچی تو غیر محفوظ ہو کر رہ گئی۔ مشیت نے یاددہی کے طور پر حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کو پیدا فرمایا کہ پھر قرونِ اولیٰ کی نعمتوں سے انھیں بہرہ ور روشناس کیا جائے لیکن ان کے نااہل ورثا اور ان کے بعد عاقبت نا اندیش خلفائے بنو عباسیہ کے تصور اذہان و نفوس نے اس کی رہی سہی قدسیانہ شان بھی ختم کر دی۔ اگرچہ شریعت کے نفاذ و فقہ کے چلن کے تمام ذرائع بدرجہ متحرک و فعال تھے لیکن درس گاہیں بے رونق و بے کیف تھیں۔ اخلاقی تعلیم برائے نام رہ گئی تھی پیکر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کی طاہر و پاکیزہ زندگی کے نقوش خال خال ہی نظر آنے لگے تھے۔ اب یہی کوئی درس گاہ بھی نظر نہیں آتی تھی جہاں سیرتِ طیبہؐ و کردارِ صحابہؓ کو یاد دلانے کا اہتمام کیا گیا ہو۔ اسی خلا ہی کو پورا کرنے، امت کے نفوسِ قدسیہ و سعید طبائع کی روحانی تربیت کے لیے مشیت نے امت ہی کے افراد سے برگزیدہ ہستیوں کو منتخب کر کے منصبِ ولایت پر فائز فرمایا اور اس کام کی تکمیل کے لیے انھیں خلعتِ قدرت عطا فرمائے۔ انھیں برگزیدگانِ عالم ہستیوں کو دنیا اولیا اللہ کے نام سے جانتی ہے اور آخرت ان کے سامنے سر جھکا کر سلام پیش کرتی ہے۔ ان کے سامنے دنیا اور عقبیٰ کی علاحدہ علاحدہ کوئی حیثیت نہیں ان کی نظر میں دونوں ایک جیسی ہی ہیں فرق ہے تو بس اتنا کہ یہ آگے آگے ہے اور وہ پیچھے پیچھے۔ خلفائے مملکتِ اسلام جب ہر طرح نااہل ثابت ہوئے تو اولیائے کرام نے اس کام کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کے متوازی ایک خانقاہی نظامِ حکومت کی بنیاد ڈالی۔ سید قاسم محمود لکھتے ہیں:

"اسلام میں جن لوگوں نے ایک متصوفانہ معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کی
تھی انہیں کہیں ۸۱۴ء عیسوی میں صوفیا کے اصطلاحی نام سے یاد کیا گیا" ۱؎
اور اس کوشش کا نام جس سے منشاءِ الٰہی تکمیل پاتا ہے تصوف رکھا اگرچہ
"صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کے زمانے میں یہ نام موجود نہیں تھا لیکن
اس کی حقیقت ہر شخص میں جلوہ گر تھی" ۲؎

لیکن سب سے پہلے لقبِ صوفی سے ملقب کیے جانے والے برگزیدہ فرد حضرت ابوہاشم بن شریک رضی اللہ عنہ (سنہ ۱۵۰ھ م ۷۶۷ء) ہیں۔ سب سے پہلے اسلامی دنیا نے کسی اور کو یہ لقب عطا نہیں کیا۔ صاحبِ کشف الظنون کا بیان ہے:

"سب سے پہلے صوفی، ابوہاشم تھے جنھوں نے ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔"

پروفیسر ماسینون لکھتا ہے:

کلمہ صوفی کا رواج دوسری صدی ہجری اور آٹھویں صدی عیسوی کے آخر میں
جابر بن حیان اور ابوہاشم صوفی کے ذریعہ ہوا" ۳؎

حضرت ابوہاشم صوفی رحمۃ اللہ علیہ نے ہی بمقام "رملہ" (شام) اسلام میں سب سے پہلی خانقاہ تعمیر کروائی اور حب الٰہی، تربیتِ نفس، ریاضت و عبادت کے لیے اسے اک علیحدہ مقام قرار دیا۔ یہاں تربیت پانے والے تمام حضرات "صوفی" ہی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ تصوف کی باقاعدہ تشکیل و ترتیب اور اس کے اصول و ضوابط کو مرتب کرنے والے حضرت ذوالنون مصری قدس سرہٗ ہیں آپ کا وصال ۲۴۵ھ میں ہوا آپ کا یہ قول کہ

"وہ لوگ صوفی ہیں جنھوں نے تمام کائنات میں صرف اللہ تعالےٰ کو پسند فرمایا"

دراصل تصوف کا خلاصہ ہے کہ درحقیقت اللہ تعالےٰ سے والہانہ محبت اور اس محبت میں خود کو ہمیشہ سرشار رکھنے والے عمل کے باعث ہی کوئی صوفی کہلائے جانے کا مستحق ہوتا ہے۔ ان کا یہ عمل خیر کی تعلیم اور مخلوقِ خدا سے محبت پر قائم ہے۔

۱؎ اسلامی انسائیکلوپیڈیا صفحہ ۱۰۲۶
۲؎ کشف المحجوب صفحہ ۳۴
۳؎ اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۲ صفحہ ۹۸۱ تا ۹۸۵

کیونکہ "تصوف دنیا کی دشمنی اور خدا سے دوستی کا نام ہے"[1] اور خدا کی دوستی کا ثبوت مخلوق سے محبت کرنے میں ہے۔ اس محبت کے استحکام کی خاطر ہی صوفیائے کرام نے اپنا لباس کبھی نامرغوب رکھا اور پشمینہ پوشی سے اپنے نفس کی حفاظت کی۔ ان کے لباسِ صوف اپنانے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ اسے آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے پسند فرمایا تھا کہ اس کے تانے بانوں میں دنیا سے بے رغبتی کا نکتہ چھپا نظر آتا ہے جسے زیبِ تن کر کے صوفی ہر حیثیت سے خود کو حقیر و کمتر اور سب کا خدمتگار ثابت کرتا ہے اور اپنے ذلت کی اس کیفیت کی علامت کے طور پر ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے جب وہ خدا کے حضور میں سربسجود ہو کر اس کی بڑائی و بزرگی کا اعتراف کر رہا ہو جیسا کہ حضرت سیدنا موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خداوند ذوالجلال سے شرفِ ہمکلامی کے موقع پر کیا تھا۔ ترمذی شریف میں ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
کَانَ عَلٰی مُوْسٰی علیہ السلام یَوْمَ کَلَّمَہٗ رَبُّہٗ تَعَالٰی سَرَاوِیْلُ صُوْفٍ وَجُبَّۃُ صُوْفٍ
وَکِسَاءُ صُوْفٍ وَکُمَّۃُ صُوْفٍ ط حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ
سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس روز حضرت موسیٰ
نے اپنے رب سے کلام کیا تو ان کے جسم پر از سرتاپا پورا لباس اون کا تھا۔ ٹوپی
پاجامہ، کرتا، چادر سبھی اون کے تھے"۔[2]

قدرت نے اون میں ایک ایسی عظیم و مستقل قوت و خوبی پوشیدہ رکھی ہے کہ اس کے پہننے سے عزم و ارادہ میں استقلال پیدا ہوتا ہے، فروتنی و عاجزی کے جذبات ابھرتے ہیں اور انھیں تقویت ملتی ہے۔ وقوفِ ذات، مجاہدات و مشاہدات کے وقت خیالات میں ہمواری و یکسانیت اور تصور و تصدیق کے لمحات میں یکسوئی پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہر "موجودِ غیر" سے بے نیازی کی علامت ہے یہی باعثِ سرورِ کائنات

[1] حضرت ابوالحسن نوری قدس سرہٗ، تذکرۃ الاولیا صفحہ ۲۵
[2] جواہر ... ص ۲

حضور پُر نور آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس اکثر صوف کا ہوتا[۱]۔ صوف کے لباس کی اسی مداومت کے باعث قرآنِ حکیم میں آپ کو مُزمّل کے خطاب سے مخاطب کیا گیا۔ آپ نے صوف نہ صرف خود پہنا بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اس کے پہننے کی ترغیب و ہدایت فرمائی۔ حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کا لباس مستقلاً صوف ہی کا تھا۔ یہ لباس آقائے دو جہاں کو اسقدر پسند و مرغوب تھا کہ آپ کی حیاتِ ظاہری کے آخری ایام میں بھی یہ آپ کے جسمِ اطہر سے لگا موجود تھا۔ بخاری، مسلم و مشکوٰۃ میں کتاب اللباس کے باب میں حدیث نمبر ۴۱۱۲ کے تحت لکھا ہے:

"رحلت کے وقت آپ اُونی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔"

کتاب عوارف المعارف باب ذکر موت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت حضرت ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ طاہرہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ "آپ ایک موٹا تہبند باندھے ہوئے اور ایک موٹی چادر اوڑھے ہوئے تھے"[۲]۔ شیوخِ طریقت اور صوفیائے کرام نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ ظاہری کے آخری لمحات کے لباس کو صوفیانہ طرزِ زندگی کے آغاز کا نقطہ قرار دیکر اسے اتباعِ سنت کی ابتدائی منزل قرار دے دیا ہے۔

حضرت ابو علی رودباری قدس سرہٗ نے فرمایا ہے:

"صوفی، صوف کا لباس پہنے اور نفس کو جفا اور بلا میں مبتلا کرے اور دنیا سے بے تعلق ہو کر رسولؐ کی سنت پر چلے"[۳]۔

مختلف روایات اور احادیثِ طیبہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو مقاصدِ فقر و معرفتِ الٰہی اور حبِ یزدانی کے حصول کے لیے فرمایا تھا "عَلَيْكُمْ بِلُبْسِ الصُّوفِ تَجِدُونَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ فِي قُلُوبِكُمْ" تم اون کا لباس پہنا کرو تاکہ ایمان کی حلاوت اپنے دل میں پاسکو۔"[۴]

۱؎ [illegible] علیہ وسلم [illegible] کشف المحجوب ص ۱۳

۲؎ صحیح مسلم کتاب اللباس [illegible]

۳؎ اسلامی [illegible] کراچی ص ۹۰

۴؎ کشف المحجوب [illegible]

[illegible] اعلیٰ ترین مکارمِ اخلاق اور اوصافِ حمیدہ کا تقاضا کرتی ہے۔ جیسے یہ نعمت [illegible] خدا ہی کے لیے اور مخلوقِ خدا سے خدا ہی کی محبت کی خاطر، محبت و نفرت [illegible] سے بے زادہ، خلائق و مظاہر سے دور حقائق و خالقِ اکبر سے [illegible] اس صوف پہننے سے نفس کے خطرات کی ہر لمحہ نفی ہوتی رہتی ہے۔ اصلاحِ [illegible] خیالات کی پاکیزگی، خیرالعمل کی تلقین، شدتِ مجاہدہ، تکثیرِ نوافل اس کے لازمات [illegible] کے باعث

"جسے محبت صاف و پاکیزہ بنا دے وہ صافی ہے اور جسے
خود محبوب صفائی اور پاکیزگی بخشے وہ صوفی ہے"۔ [1]

[illegible] نے جب صوفیائے کرام کو جلالتِ فکر و حلاوتِ ذکر و ایمان کی نعمت سے بہرہ مند [illegible] فقر پہنایا تو ان کا غیر متزلزل و مستحکم ارادہ فلسفۂ الٰہیاتِ اسلامی کی نئی جہتیں [illegible] صدی ہجری کی دہلیز پر عصائے کلیمی لیے کھڑا ہو گیا۔ جلالتِ فکر کا منصب [illegible] نے تحریر و تقریر سے عزائم کو فتح کر لیا تو حلاوتِ ذکر کے حامل نفوسِ قدسیہ نے [illegible] سے خطرات کی نفی کر دی۔ علامہ بدرالدین سرہندی قدس سرہٗ خلیفہ حضرت مجددالف ثانی [illegible] نے لکھا ہے:

"ایک جماعت نے بارِ وجود سے تسکین کے لیے سماع و رقص
کو اختیار کر لیا اور ایک جماعت نے خود کو تصانیف میں مصروف کر لیا"۔ [2]

[illegible] اپنی ایک حیثیت ہے اور دونوں ہی حق پر ہیں۔ اسی حیثیت نے ان کے افکار عالیہ عارفانہ [illegible] تقسیم کر دی ہے۔ ان میں سے ایک نظری حیثیت کا حامل ہوا اور دوسرا عملی حیثیت کا پابند

[1] کشف المحجوب

[2] حضرات القدس ص ۱۵۶

نظری جہت رکھنے والوں نے وحدت الوجود کو اپنا لیا اور عملی جہت قبول کرنے والوں نے وحدت الشہود کو۔ چونکہ وجود ایک ہے اور ساری کائنات اسی کا مظہر ہے اور یہ تمام مظاہر اپنے ہونے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے اس لیے وحدت الوجود حق ہے۔ جبکہ وحدت الشہود میں یہ کائنات حق کا آئینہ ہے اور آئینہ اپنے ہونے میں صرف آئینہ ہے وجود نہیں تو وجود کے بغیر آئینہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا اس لیے صوفیت کی نظری حیثیت ہی اعلیٰ و برتر ہے کیونکہ اس میں عمل بھی شامل ہے۔ چونکہ نظریہ خود علم کا تقاضہ کرتا ہے اس لیے اسے تفوق حاصل ہے اور اسی کے باعث صوفی صاحبِ حال، صاحبِ ذوق اور صاحبِ مکاشفہ ہوتا ہے یہ بات صوفیت کی عملی حیثیت میں نہیں کہ عمل میں صرف معیت ہے حضوری نہیں، شوق ہوتا ہے ذوق نہیں۔

ذوق علم کا متقاضی ہے اور علم ادب کا اس لیے بقول سید الطائفہ جنید بغدادی رضی اللہ عنہ

"ہمارے مسلک کے مطابق ایمان لانا ہی ولایت ہے"[1]

بڑے کٹھن اور کانٹوں سے پُر راستے پر چلنے کا معاملہ ہے اور جس نے یہ راہ طے کر لی گویا اس نے باطن سر کر لیا ہے۔ صوفیت کی اسی جہت و حیثیت کے حامل حضرات قدس کو صوفی کہا گیا ہے اور ان کے عمل کو تصوف اور ان کے مسلک کو "صداقت" سے تعبیر کیا گیا۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ نے لکھا ہے

"تصوف کی بنیاد صداقت پر ہے اور دکھاوے کی اس میں گنجائش نہیں"[2]

حضرت... کا ایک شعر ہے: ؎

مرا یکاں عجب کیا ہے جو بیانِ تصوف ہے آں صدق جان بامذہبِ عاشقی جان تصوف ہے

[1] عوارف المعارف صفحہ ۲۰

[2] عوارف المعارف صفحہ ۸۳

تصوف کا ماخذ بنیادی طور پر قرآن حکیم ہے۔ قرآن حکیم کی تعلیمات میں ظاہر و باطن دونوں ہی قسم کی باتوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ قرآن حکیم کی جن باتوں کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے انھیں محکمات کا نام دیا گیا اور جن کے سمجھنے کے لیے اعلیٰ شعور، گہری فکر اور تعمق نظر ضروری ہے انھیں متشابہات سے موسوم کیا گیا۔ عرف عام میں انہی کو ظاہر و باطن بھی کہا جاتا ہے۔ سید قاسم محمود لکھتے ہیں:

صوفیا کے نزدیک اسلامی علوم کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری اور دوسری باطنی ظاہری علوم سے مراد شریعت ہے اور باطنی علوم سے مراد تصوف ہے۔[1]

حقیقت تصوف حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے ایک ایک لمحہ کی بات کا نام ہے تصوف کو سمجھنا ہو تو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ابتدائی زندگی کا لائحہ عمل بنا کر اسے اپنی ساری زندگی پر محیط کر لیا تھا انھیں کے نقش قدم پر چل کر اولیائے کرام نے ہے اس حیات کو مقام دیا جس کے باعث وہ صوفی کہلائے اور ان کی تعلیمات کا نام "تصوف" قرار پایا۔

تصورِ وحدت الوجود تمہید

"تصورِ وحدت الوجود" جو حقیقتاً اظہارِ بیان کی سلیقہ مندی اور کثرتِ تمثیل کا طالب و متقاضی ہے۔ اس میں نامناسب، ناکافی الفاظ، ناموزوں و غیر متحمل زبان سے کام لیا جائے تو دل میں اتر جانے والی بات بجز تحیرِ محض کے ہے صرف غلط تفہیم و نادرستِ تعبیر کے باعث نہ صرف انسان کو قعرِ ذلت میں گرا دیتی ہے بلکہ اس کو مقامِ فسق و الحاد تک بھی پہنچا دیتی ہے جہاں سے لوٹ کر آنا اس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔ مولانا ... صاحب مترجم "انسانِ کامل" نے "انتباہ فی معارف الاولیاء" کے عنوان سے ابتدائی سطروں میں تحریر کیا ہے:

> "حضراتِ صوفیا کے اس قسم کے علوم سے اکثر اہلِ نفس و ہوا، دلیر ہو کر شرعی قیود سے نکل گئے ہیں۔ شرعی علوم کو قشورِ ان علوم کو لب لباب خیال کر کے ورطۂ الحاد و زندقہ میں جا پڑے ہیں۔"

"وحدت الوجود" کا تصور پیش کرنے کی ضرورت عموماً ایسے ہی مقامات پر ضروری ہوتی ہے جہاں پہلے سے یہ تصور عوام و خواص میں مقبول تھا اور اس کی غلط تفہیم کے باعث لوگ گمراہ ہو رہے ہوں۔ چنانچہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جن جن مقامات پر اس تصور کو پیش کیا گیا ہے وہ وہی مقامات تھے جہاں اس تصور کے ماننے والے اس کی غلط تعبیر کر کے ہوا و حرص کے بندے بن چکے تھے۔

جواہر اسرار اللہ کا

تصوّرِ وحدت الوجود

جواہر اسرار اللہ کے ابتدائی شعر سے آخری نکتے تک تصورِ وحدت الوجود کو مختلف طور و طریقوں اور نئے نئے ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ حضرت قدس سرہٗ نے نظریۂ وحدت الوجود کی حمایت اور اس کی حقانیت کے ثبوت میں بے شمار مثالوں سے اسے سجایا ہے۔ تذکرہ نگاران و مورخین تاریخِ ادبِ اُردو نے بھی اس حقیقت کی طرف واضح طور پر اشارے دیے ہیں۔ نجیب اشرف ندوی کا بیان ہے:

"وہ وحدت الوجود کے قائل تھے، اس لیے ہر چیز میں ان کو خدا ہی کا جلوہ نظر آتا تھا۔"[1]

ڈاکٹر جمیل جالبی کا بیان ہے: "شاہ علی محمد جیو گام دھنی کا کلام فلسفۂ ہمہ اوست کا ترجمان ہے۔"[2]

[1] علی گڑھ تاریخ ادب اردو ص۱۰۹

[2] تاریخ ادب اردو ص۱۱۵

اور اس میں اثباتِ توحید، وجودِ واحد اور اسرار اللہ کو مختصر الفاظ میں اشاروں میں بیان کیا ہے۔[۱]

محمود شیرانی رقمطراز ہیں :

" دیوان کی اکثر و بیشتر نظموں کا موضوع مسئلہ وحدت الوجود ہے "[۱]

ظہیر الدین مدنی نے لکھا ہے :

نظموں کا موضوع وحدت الوجود ہے "[۲]

دیوان کے مرتب اول شیخ محمد عبدالرحمان القریشی الاحمدی نے جواہر اسرار اللہ کے دیباچے میں تحریر کیا ہے :

" آنحضرت بلسانِ دربار دجوہر نثار بطریق نظم بہ الفاظِ گوجری بہ زبانِ مبارک خود فرمود در اثباتِ توحید و وجودِ واحد "[۳]

مرتب ثانی نے اس دیباچے میں اظہار کردہ اس وضاحت کو ناکافی جان کر سے اس طرح قلمبند فرمایا :

" آں بلسانِ دروبار د گوہر نثار بطریق نظم بہ الفاظِ گوجری کہ گاہے بہ زبانِ حق بطریقِ ترجمانی وگاہے بہ زبانِ الیشاں یعنے گاہے بہ قرب نوافل وگاہے بہ قرب فرائض بوقتِ مکاشفات و مشاہدات، و معاینات و معائنات فرمود۔ در بیان اسرار کہ در اثباتِ توحید و وجود واحد و وجود مطلق با دلائل و براہین عقلی و نقلی و وجدانی و تمثیل آں دریں مختصر آوردہ جمع کردہ شد "[۳]

مندرجہ بالا چاروں محققین کے حوالوں میں جواہر اسرار اللہ کا موضوع " وحدت الوجود " ہی ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ۔ مرتبین جواہر اسرار اللہ نے بھی اس موضوع کے قطعی ہونے کا مثبت اظہار " اثباتِ توحید " " وجودِ واحد " و

[۱] تاریخ ادب اردو ص ۱۱۵

[۱] مقالات جلد اول ص ۱۸۲

[۲] مخزن گجرات صفحہ ۵۹

[۳] مخطوطہ سالار جنگ ص ۲

[۳] مخطوطہ سالار جنگ

وجودِ مطلق" کے الفاظ سے کیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ مرتبِ ثانی سید ابراہیم قدس سرہٗ نے "قربِ فرائض" و "قربِ نوافل" کی اہم صوفیانہ اصطلاحات کا ذکر اپنے دیباچے میں کر کے اس دیوان کے بنیادی تصور اور مرکزی تخیل کے بارے میں بس فیصلہ ہی کر دیا۔ اس سلسلے میں دیباچۂ مرتبین کی اصطلاحات کا مختصراً افہام خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

عام طور پر تصوف سے دلچسپی رکھنے والے اور الٰہیاتِ اسلامیہ میں گفتگو کرنے والے اصحابِ علم و عرفان نے بعض اہم صوفیانہ نکات کو عوام اور ان کے غیر مرتب و ناپختہ ذہن سے چھپائے رکھنے کے لیے کچھ علامتیں اور کچھ اصطلاحیں وضع کیں جس کے بطن میں وہ حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں کہ انھیں اس کے اہل ہی کے سامنے بولنا مفید ہوتا ہے ذیل میں ان اصطلاحات کی وضاحت کی جاتی ہے

اثباتِ توحید[1] سے تمام موجودات کی صورتیں مراد لی جاتی ہیں جہاں انکے نام جدا جدا ہوتے ہیں مگر اُن کی اصل اور حقیقت ایک ہی ہوتی ہے۔

وجودِ واحد[2] دراصل اشارہ ہے کَانَ اللّٰہُ وَلَا شَیْءَ مَعَہٗ کی طرف کہ جس کے معنی ہیں اللہ تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہ تھی اور اب بھی وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ تھا۔

وجودِ مطلق، فی الحقیقت دو مختلف حقیقتوں "خلق و خالق" کی اصل کا نام ہے جہاں وہ ایک جہت میں بغیر حلول کے کائنات کے ہر ذرہ میں جاری و ساری اور اپنے ذاتی کمال سے موجود ہے تو دوسری جہت میں کائنات سے جدا اس کے حرف معنی و مفہوم کے ساتھ موجود ہے یعنی ہر شئے موجود سے اللہ کی حقیقت معلوم کرے اور اسی کی وحدت سے ہر شئے کا علم حاصل کرے۔

قربِ فرائض: ذاتِ باری تعالےٰ سے تقرب حاصل کرنے کے دو معلوم ذرائع ہیں۔ یہ تقرب اگر اللہ تعالےٰ کی طرف سے بندہ پر بطور احسان ہو تو یہ اس کا فضل ہے کہ جسے وہ چاہے عطا کرے۔ اسی کو قربِ فرائض

[1] رسالۃ الطالبین، جنید بغدادی ... اثبات التوحید ... فی ذات التوحید ... توحید کو ثابت کرنا ... حقیقۃ القرب ... نصوص الحکم ... ص ۱۱۵

[2] یعنی اللہ کا وجود اپنی ذات سے ہے یعنی موجود بالذات جبکہ مخلوق کا وجود بالذات نہیں بلکہ باری تعالیٰ سے ہے

کہتے ہیں اور عرفِ عام میں یہ ولایتِ سلبی کے نام سے مشہور ہے۔ دوسرا ذریعہ اس کے قرب کو معلوم کرنے کا قربِ نوافل ہے۔ اس تقرب کے حصول میں علاوہ اللہ کے فضل و کرم کے بندہ تا عمر ریاضتوں عبادتوں اور مشقتوں سے اپنی ذات کو اس لائق بناتا ہے کہ اسے اللہ کا قرب حاصل ہو جاتا ہے اس کے بعد بھی اس کی نظر ہمیشہ اس کے فضل کی جویا رہتی ہے۔ مولانا عبدالقدیر صدیقی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔

"صاحبِ قربِ نوافل توجہ و ہمت کا زور خوب لگاتا ہے اس کا
[illegible] بڑی قوی رہتا ہے۔ صاحبِ قربِ فرائض
اپنے عدمِ اصلی پر نظر کرتا اور بے ہمت و بے ارادہ رہتا ہے۔" [1]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا بیان ہے:

"حکیمِ ربانی کو قربِ الوجود، ولی کو قربِ نوافل اور نبی کو قربِ فرائض
کے مقام میں توغل اور قدمِ راسخ حاصل ہوتا ہے۔" [2]

وحدت الوجود، ایک دقیق فلسفیانہ اور خشک تر علمی موضوع ہے۔ اس پر گفتگو کرنے کا حقدار وہی شخص ہو سکتا ہے جس کو زبان پر عبور، صحیح مذاق، دقائقِ علمیہ کا درک اور منازل و مقاماتِ سیر کے علم سے پوری واقفیت ہو، جہاں تجرباتِ روحی و تمیزاتِ نفسی ہمہ وقت اس کے پیشِ نظر ہوں۔ مولوی فضل میاں صاحب نے لکھا ہے:

"وحدت الوجود کے معنی حقیقت الجامعہ کی معرفت میں مستغرق ہو جانا
ہے جس میں جمیع عالم فانی ہو جاتا ہے۔" [3]

حضرت شیخ کمال الدین عبدالرزاق کاشی قدس سرہٗ سے کسی نے سوال کیا "وحدت الوجود کیا ہے؟" آپ نے فرمایا:

[1] فصوص الحکم، نقش حکمت علیہ فی کلمۃ ابراہیمیہ صفحہ ۲۱۶ مطبع جامعہ عثمانیہ
[2] تفہیماتِ الٰہیہ صفحہ ۱۵
[3] [illegible]

"ہمہ اوست نہ ہر ایک اوست"

حضرت سیدی مبارک علیشاہ صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔

"اصطلاح میں مراد اس سے یہ ہے کہ فرش سے عرش تک
اور عرش سے جہاتِ ستہ غیر متناہی تک بجز ایک وجود باری تعالیٰ
کے دیگر کوئی وجود نہیں" ۱

صاحبِ "توضیح سر العیان" لکھتے ہیں:

"مسئلہ وحدت الوجود کا اسرارِ الٰہی سے ایک بڑا سر ہے جس کے
کشف کے بعد جملہ اسرار، تنزلات و رموزِ عینیت، معیت وغیرہ
خود بخود منکشف ہو جاتے ہیں۔ "وحدت الوجود" معنی
کلمہ توحید ہے" ۲

علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے کہا ہے:

"ذاتِ الٰہیہ کے لیے کائنات کوئی مخصوص حادثہ نہیں کہ اس کا
ایک (حادثہ) قبل اور ایک (حادثہ) بعد ہو اور نہ کائنات اپنی ذات
سے آپ قائم کہ اس کا غیر ٹھہرے۔ ورنہ اس کا مطلب تو یہ ہوگا
کہ خالق و مخلوق دو الگ الگ وجود ہیں اور دونوں مکان کی لامتناہی
وسعتوں میں" ۳

انھوں نے اس کی مزید وضاحت اپنے ایک مقالے میں اس طرح کی۔

"مسئلۂ وحدت وجود گویا مسئلہ تنزلاتِ ستہ کی فلسفیانہ تکمیل ہے

---

۱ مقدمہ فصوص الحکم، مطبع احمدی، کانپور، ص ۱۳۲
۲ ضیاء الاربعین، شرح ... حیدرآباد، ۱۳۰۰ھ
۳ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، نذیر نیازی، ص ۱۰۰، ۱۹۸۶

بلکہ یوں کہیے کہ عقلِ انسانی خود بخود تنزلِ ستہ سے وحدت الوجود تک پہنچتی ہے۔ اکثر صرف اسی مسئلے کے قائل ہیں بعض اس طرح کہ یہ محض ایک کیفیتِ قلبی یا مقام کا نام ہے۔"[1]

اور یہ بیت کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

"هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ، وحدت الوجود کے یہ معنی ہیں۔"[2]

مزید اس کی صراحت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

"خواجہ سرور رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ "تا وقتیکہ کوئی شخص توحید وجودی کا نہیں ہے حصولِ فنا فی اللہ اس کے وجود کو نہ ہوگا اور اس کے منکر کے حق میں تمام فنائیں پردہ میں ہیں اور غیر حق ہیں اور تمام تجلیات انوار کو ظہوراتِ حق تعالیٰ نہ جانے گا اور تحقیق توحید وجودی کی بہت طویل ہے لیکن آیاتِ کلام اللہ اور احادیثِ رسول اللہ کہ جن سے مثل نَحْنُ اَقْرَبُ وغیرہ معیت اور قربت پائی جاتی ہے اس بات کو بخوبی ثابت کرتے ہیں۔"[3]

حضرت سیدی بایزید بسطامی قدس سرہٗ کے درس کی ایک مجلس میں آپ کے ایک مرید نے آپ سے مباحثہ کیا اور کہا کہ "ایک وقت ایسا بھی تھا کہ سوائے خدا کے کچھ نہ تھا صرف خدا ہی کا وجود تھا (ان اللہ لم یکن معہٗ شیئ) تو حضرت بایزید قدس سرہٗ نے فرمایا: "اب کیا ہے، اب بھی خدا ہی کا وجود ہے۔"

سیدی ابوالحسن خرقانی قدس سرہٗ العزیز نے اپنے ارشادات میں فرمایا:

خطاب اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ بعض بندوں نے اس طرح سے سنا ہے "نہ ہم منم"

---

[1] اخبار وکیل امرتسر۔ ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء

[2] فتاویٰ عزیزی ص ۲۹۶

[3] ایضاً ص ۳۶ و ص ۳۷

کیا سب میں ہی نہیں ہوں"۔ ۱؎

حضرت سیدی منصور حلاج قدس سرہٗ کو عبادت کرتے ہوئے دیکھ کر

"کہ آپ دن رات میں ایک ہزار رکعت نماز قید خانے میں پڑھا کرتے
تھے"۔ ——— لوگوں نے پوچھا: آپ "انا الحق" کہتے ہیں
جب آپ خود حق ہیں تو یہ نماز کس کی پڑھتے ہیں"، آپ نے فرمایا:
"اپنی قدر ہم خوب جانتے ہیں"۔ ۲؎

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے یہ بڑی خاص فلسفیانہ بات کہی:

"اصل بات یہ ہے کہ صوفیا کو توحید اور "وحدت الوجود" کا مفہوم
سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ یہ دونوں اصطلاحیں مرادف نہیں بلکہ
مقدم الذکر کا مفہوم خالص مذہبی ہے اور مؤخر الذکر کا مفہوم خالص
فلسفیانہ ہے"۔ ۳؎

لیکن یہ حقیقت ہے، فلسفہ نہیں کہ ایک صاحب دل کا تجلیات الٰہی سے مغلوب ہو کر حالت تحیر میں ٹھہر جانا کہ اسے اپنی ذات کا عرفان بھی نہ ہو اور اپنے گرد و پیش کے علم سے غفلت بھی تو اسی کو وحدت الوجود کا مقام کہا جاتا ہے حضرت ابو بکر واسطی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

"خود موجود ہو کر اسے موجود جاننا برا ہے، بلکہ خود فنا ہو کر اسے
موجود جاننا چاہیئے"۔ ۴؎

حضور اکرم سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم وصحابۂ ذی حشم رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کے دور اقدس سے زمانہ موجودہ تک سبھی صوفیائے کرام علیہ الرحمۃ کا مسلک "توحید" ہی رہا ہے۔ ہر ایک قابل احترام

۱؎ تذکرۃ الاولیا حصہ دوم صفحہ ۱۴۲

۲؎ ایضاً حصہ دوم صفحہ ۹۹

۳؎ اقبال اور جمالیات صفحہ ۶۸

۴؎ تذکرۃ الاولیا حصہ دوم صفحہ ۹۹

کسی نے اسی عقیدے وعلم کی اشاعت وتبلیغ میں مقدور بھر اپنا اپنا حق ادا کیا لیکن صحیح یہ ہے کہ کسی نے بھی "وحدت الوجود" کو بطور ایک لازمی وبنیادی عقیدے کے، زمانے کے سامنے پیش نہیں کیا۔ اس باب میں جو جس حال کا مکلّف نظر آیا اُسے وہی عطا کیا گیا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا یہ بصیرت افروز بیان کسی قدر حقیقت سے قریب ہے ملاحظہ ہو:

"بخاری، کتاب العلم میں جناب امیرالمومنین علی کرم اللہ وجہہ سے موقوفاً اور بعض کتب میں مرفوعاً یہ حدیث وارد ہے کہ کلام کرو لوگوں سے اس طرح جو سمجھ سکیں کیا تم دوست رکھتے ہو اس بات کو کہ خدا اور خدا کا رسول جھٹلائے جائیں۔ مسئلہ وحدت کی نسبت شرع میں صراحتاً کوئی امر نہیں آیا ہے نہ کتاب میں نہ حدیث میں، حضراتِ صوفیا نے تائیداً کشف اور شہود جو مدار اس مسئلہ کا کتاب اور سنت سے (ہے) اس کی طرف اشارہ کیا ہے مثل اَلَا اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ[1]۔ پس اگر مخاطب عوام میں سے ہے اور فرقِ مراتب نہ کرسکتا ہو تو اس کے سامنے ایسے مسئلے کا بیان کرنا الحاد و زندقیت سے خالی نہ ہوگا" (ملہ فتاویٰ عزیزی صفحہ ۹۱، ۹۲)

وحدت الوجود دراصل یہ نہیں ہے کہ ہر شئے میں خدا حلول کرگیا ہے (نعوذ باللہ) بلکہ یہ ہے کہ ہر شئے میں خدا کی صفات کا ظہور ہے اور جب اس کا قائل فنافی اللہ ہوچکا ہے تو اب وہ اس ہیئت میں باقی ہی نہیں رہا جس کی موجودگی سے وہ اپنی ذات کا ادراک کرتا رہتا تھا۔ علمی گفتگو میں اسے ہمہ اوست، معنیٔ کلمۂ توحید، وجودِ واحد، بالہیئت غیر موجود، تنزلاتِ ستّہ، جہت بلا جہات، نفسِ کلیہ، وجودِ منبسط کہتے ہیں، جو اپنی عینیت میں

[1] حضرت لبید بن ربیعہ عامری رضی اللہ عنہ ... الا کل شیٔ ما خلا اللہ باطل ... سب سے سچی بات جو کسی شاعر نے کہی وہ لبید کی یہ بات ہے کہ اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔ حضرت لبید بن ربیعہ عامری ۵۶۰ء میں قبیلہ بنو عامر میں پیدا ہوئے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے ابتدائی ایام میں ۶۶۱ء میں ... سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے ... (الاستیعاب)

ثابت اور اپنے ہونے میں "حق" ہے اگر اس کا کوئی غیر ہوتا تو اس غیر کا غیر بھی وجود لازماً ہوتا اور اسے الگ الگ وجود کی حیثیت سے ماننا لازم آتا جو خطا ہے سراسر منافی معنیِ وجود ہے۔ جنابِ مبکش اکبرآبادی نے اسی طرف اشارہ کیا ہے:

"یہ وجود، دو ہو ہی نہیں سکتے کیوں کہ وجود کے علاوہ جو کچھ ہے
وہ عدم ہے جس پر "ہے" کا لفظ صادق نہیں آسکتا۔ اس
لیے کہ عدم کوئی شئے نہیں ہے۔" [۱]

مولانا عبدالسلام خاں پرنسپال مدرسہ عالیہ رامپور نے لکھا ہے:

"جب تک کسی شئے میں ان کی اصل نہ ہو اس شئے کو ان اوصاف
سے موصوف نہیں کیا جاسکتا، بینا صفت ہے، بینائی
اس کی اصل ہے جب تک کسی شخص میں یہ اصل موجود نہ ہو اس کو
بینا نہیں کہتے۔" [۲]

حضرت عبدالکریم الجیلی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

خلق میں عنقائے مغرب، حق میں اسم اللہ کی ضد ہے۔ جس طرح
مسمیٰ عنقا فی نفسہٖ عدمِ محض ہے ایسا ہی مسمیٰ اللہ فی نفسہٖ موجود ہے۔" [۳]

غالب کا شعر ہے:

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی   ہر چند کہیں کہ "ہے" "نہیں ہے"

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ "وحدت الوجود" حق ہے اور عین مطابقِ منشاءِ الٰہی ہے۔ اس کا جاننا کمال نہ جاننا بے کمالی ہے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ "وحدت الوجود" کا

[۱] نقد اقبال صفحہ ۸۴
[۲] افکار رومی صفحہ ۸۲
[۳] انسان کامل مترجم فضل میراں صاحب صفحہ ۴۲-۴۳

لم حاصل کیے بنا ہی خدا کو پہچان لے گا وہ دراصل غفلت میں ہے، اسے خدا کی حقیقت کا علم حاصل ہونا دشوار ہے اور وہ خدا کے منشا کی تکمیل سے قاصر ہی رہے گا۔ اس بارے میں وہ نکتہ جس کا بلیغ ترا ظہار باری تعالےٰ نے اپنی کتاب محکم میں فرمایا ہے یہ ہے:

قَالَ فِیہِ کُنْتُ سَمْعَہٗ وَبَصَرَہٗ وَمَا قَالَ کُنْتُ عَیْنَیْہٖ وَ
اُذُنَہٗ فَفَرَّقَ بَیْنَ الصُّوْرَتَیْنِ ط

چوں کہ اللہ تعالےٰ نے آدم کی ظاہری صورت، عالم کے باطنی حقائق سے پیدا فرمائی اور عالم کی ظاہری صورت کو آدم کی باطنی حقیقت سے پیدا فرمایا اس لیے اس نے آدم کے مقام و مرتبے کو ظاہر کرتے ہوئے کہا: "میں اس کی سماعت ہوتا ہوں اس کی بصارت ہوتا ہوں۔" یہ نہیں کہا کہ میں اس کا کان ہوتا ہوں اس کی آنکھ ہوتا ہوں۔ یہی وہ فرق ہے جو دانشمندوں کے لیے رکھا گیا ہے کہ وہ اسے شناخت کرلیں اور اس شناخت کا سلیقہ جس علم سے انسان کو حاصل ہو سکتا ہے اس کا نام عرفا نے وَحْدَتُ الْوُجُوْدِ لِلّٰہِ تَعَالٰی[۱] رکھا ہے۔

وحدت الوجود کے معلم اول سیدنا ہود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں جیسا کہ شیخ اکبر حضرت سیدنا محی الدین ابن عربی رضی اللہ عنہ نے فصِ ہودیہ میں لکھا ہے کہ حضرت سیدنا ہود علیہ السلام سے مقامِ شہود پر گروہ انبیا میں ملاقات ہوئی اور وہیں آپ نے امورِ حقائق ظاہر فرمائے اور انھیں تعلیم فرمایا آپ کے الفاظ یہ ہیں:

عَارِفًا بِالْاُمُوْرِ کَاشِفًا لَھَا وَدَلِیْلِیْ عَلٰی کَشْفِہٖ لَھَا [۱]

امورِ حقائق کیساتھ امورِ حقائق کو کھولنے والے اور میری دلیل (ہود علیہ السلام) کے کشف سے امورِ حقائق پر مستحکم ہوئی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحدت الوجود اور کشف کی تعلیم سیدنا ہود علیہ السلام سے آپ نے پائی۔ وحدت الوجود کے حق اور عین ایمان ہونے پر علمائے اہل سنت و الجماعت کے چند اقوال اہلِ بصیرت کے لیے درج ذیل ہیں:

ان کی کنیت ابوعقیل تھی۔ آپ ۱۰۱ سال حیات رہے۔ نقد اقبال کے مولف نے ان کی عمر ۱۵۷ سال لکھی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب ان سیکلوپیڈیا برٹانی ۱۲۹۸ صفحہ

[۱] فصوص الحکم صفحہ ۱۰۱

مجدد الف ثانی نے اپنے مکاشفات میں ذکر کیا ہے کہ "شیخ اکبر کا معارف بھی خطا میں ہے اور ان کے بیانات کو قبول کرنے والا بھی خطا میں ہے اس لیے کہ (رمضان اللہ)"

وَقَالَ اَبُو حَنِیفہ رضی اللہ عنہ " وَھُوَ الشَّیُ لَا کَالْاَشْیَاءِ وَ مَعْنَی الشَّیُ ثَابِتٌ (الموجود فقہ اکبر)

قَالَ ابو المنتھی مَعْنَی الثَّابِتُ "الموجود"

وَقَالَ الشَّافِعِیُ شَھِدتُ بِاَنَّ اللّٰہَ لَا شَیَ غَیرُہٗ

وَقَالَ عَلِی القَارِیُ لَیسَ شَیٔ مُستَقِل فِی الوُجُودِ اَو فِی الشُّھُودِ سِوَی اللّٰہ

فتوحاتِ مکیہ باب قنوت میں شیخ اکبر رضی اللہ عنہ نے بڑی دلچسپ بات کہی ہے:

" اللہ تعالیٰ نے فرعون کی زبان سے کہا: اَنَا رَبُّکُمُ الاَعلٰی

گویا صفتِ حق زبانِ فرعون سے ظاہر ہوئی جیسا کہ نمازی کی زبان سے "سمع اللہ لمن حمدہ" کا اظہار ہوتا ہے۔"

اس تصورِ وحدت الوجود کے بنیادی مقاصد میں عالم گیر محبت کا راز پوشیدہ نظر آتا ہے۔ وحدت الوجود اللہ تعالیٰ کا قائل اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہر شئے سے خدا کے لیے ہی، محبت کرنے کا پابند ہے۔ یہ ایک ایسا راز ہے کہ جس پر یہ منکشف ہوگیا اس کی روح کو پاکیزگی اور نفس کو طہارت حاصل ہو جاتی ہے جہاں وہ الحق محسوسٌ والخلق معقولٌ وموھومٌ کہ اس لمحہ اور مقام کا ادراک حاصل کر لیتا ہے جس کا حصول اس کی حیات کا منشا و مقصد ہے اسی کی تکمیل کے لیے انسان کی تخلیق کی گئی اور اسے "فی الارض خلیفہ" کہہ کر ملائکہ میں اس کے مقام و مرتبہ کو ظاہر کیا گیا اور اسے عظمت و یقین کی دولتِ سرمدی سے سرفراز فرما کر نیابتِ اولیٰ کا تاج پہنایا گیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے بڑے پتے کی بات کہی:

وحدت الوجود کی رو سے ذاتِ باری، کائنات اور انسان میں جاری و ساری ہے۔ وہ حق اور خلق دونوں پر حاوی ہے۔ سارے عالم میں

(صفحہ ۱۲۵ کا حاشیہ) شیخ کو تو قبول کرنا چاہیے لیکن ان کی شطحیات کو قبول نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے قبول کرنے اور رد کرنے کا درمیانی طریقہ اس فقیر کا یہی ہے۔" مکاتیب ۲۱ "حضرات القدس" جلد دوم ص ۱۳۷

اصولِ وحدت کارفرما ہے موضوع اور معروض کا فرق فریبِ نظر ہے"۔[1]

اور بحر العلوم مولانا عبدالقدیر صدیقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ

وحدت الوجود میں "وجود" واقعی ایک ہے اور وحدت الشہود میں خیال ایک ہے، وحدت الوجود میں دوئی اور شرک کو گنجائش نہیں اور وحدت الشہود میں زندقہ اور بے دینی کا گذر نہیں"۔[2]

بس نصیب ہی کر دیا۔ یہی وہ علم ہے جو سیدی شاہ علی حیوگاؤں دھنی قدس سرہٗ کے مکاشفات میں از اول تا آخر جا بجا طرح طرح سے موضوع بدل بدل کر مثالوں کی جدت اور خیالوں کی پاکیزگی سے سنوارا ہوا اور ہر بغنائیت، لحن و آہنگ اور موسیقیت سے سجا ہوا نظر آتا ہے۔

صوفیائے کرام کے تمام مجاہدات اور تمام عبادات و ریاضات، استغراق و تحیر کے عالم میں وحدت کے وہ مناظر پیش کرتے ہیں جہاں انکی عبادت ان کا یادِ الٰہی میں ڈوبا رہنا، بلا تخصیص و شناختِ جہت و مقام کیفیاتِ عشقِ الٰہی میں اپنی ذات کو بھی فراموش کر دینا وحدت الوجود کا عملی مظاہرہ ہے۔ جہت کا تصور خود تصورِ غیریت کا ثبوت فراہم کرتا ہے اس لیے صوفیائے کرام نے بے جہت ہی اس کی یاد کو اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر حالت میں لازم کر لیا۔ اسی کیفیت کا دوسرا نام "قلب جاری" بھی ہے "ھو الاول والآخر والظاہر والباطن" دراصل خدا کی لا محدودیت کو محدود عقل کے حال کو سمجھانے کا اک سہل طریقہ ہے یعنی سب اللہ کی صورتیں ہیں لیکن کوئی صورت "اللہ" نہیں۔ ہر شئے حقیقتِ اللہ ہے اور اس شئے کی صورت ہی اس کا غیر ہے۔ جیسا کہ آئن سٹائن نے کہا: "مادہ خود غیر مادی قوت ہے"۔

---

[1] روحِ اقبال سنہ ۱۹۴۱ء صفحہ ۲۹۶

[2] العرفان صفحہ ۲۲۴ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے لکھا ہے: "توحیدِ وجودی کا اعتقاد ضروریاتِ اسلام کے اندر نہیں ہیں اگر کوئی اس کا اعتقاد نہ رکھتا ہو جانا تو اسلام میں اس کے کوئی نقصان نہیں مگر اولیاء اللہ توحید وجودی کے قائل ہوئے ہیں ان کی تحقیر و توہین اور تکفیر و تضلیل نہ کرنا چاہیے"۔ فتاوائے صفحہ ۱۲۶ فتاوائے عزیزی

تصورِ حسن و عشق

یہ عالمِ رنگ و بُو، یہ کائناتِ خوب رُو، یہ منظم و مرتب شام و سحر، یہ مضطرب پرجلال موجِ بحر، سب اُسی کے جمال کی ایک جھلک ہیں۔ اس کا جلال، عظمت و کبریائی کی چادر میں چھپا ہوا ہے، اس کا جمال اس کی ذات کی اعلیٰ ترتجلی کا پرتو ہے۔ جلال خود اس کے جمال کا پردہ ہے اور جمال اس کی ذات کے عرفان کا ایک ذریعہ۔ اگر اس کا جمال عام نہ ہوتا تو ہر شئے اس کے جلال کی شدت کی تاب ہی نہ لاتی اور جل کر خاکستر ہو جاتی۔ اور اس کی ذات کا عرفان حاصل کرنا انسان کے لیے مشکل ہو جاتا۔ انسان فطرتاً اللہ کی فطرت اور طبعاً اُس کا عین ہے اس لیے فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا سورہ روم ۳۰/۳۰ کے مطابق وہ بھی حسین ہے اور حسن کو پسند کرتا ہے وہی مقام پر کہا گیا ہے اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ وَّيُحِبُّ الْجَمَالَ۔ اس لحاظ سے ساری دنیا حسین ہے اور دنیا کی ہر شئے میں حُسن ہے۔

یہ بات قطعی ہے کہ ہر شئے اپنی ہئیت و تعین میں مکمل پیدا کی گئی ہے جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ سورہ ۳۲/۹۔ اول ہی اول جب "منظرِ وجود" اپنی ہئیت و تعین میں آئینے کا مکمل ہوا تو اس میں خالقِ کائنات نے خود کو چاہت کی نظر سے دیکھا اور بڑی دیر تک اس پر یہی کیفیت طاری رہی پھر یہ منظرِ وجود تجلیِ اول کی صورت میں عالمِ منبسط کا روپ دھار کر جمال کی چادر اپنے چہرے پر ڈال لی اور جلال کے پردہ میں سا چھپ گیا۔ مولانا روم فرماتے ہیں: ؎

کُنت کنزاً گفت مخفیاً شنو جوہرِ خود گم مکن اظہار شو

اسی اظہار کا نام ہی تو حُسن ہے۔ یہی تو چھپے ہوئے خزانوں میں سے ایک خزانہ تھا جب اس نے چاہا کہ

[illegible] وہ ظاہر ہو گیا۔ اگر حسن کا یہ خزانہ عالم میں بکھرا نہ گیا ہوتا تو ہر شئے خود اپنی شناخت سے محروم ہو جاتی اور
[illegible] سے قبل ہی معدوم ہو جاتا۔ حسن بہ ازل ہی سے دو ایسی آنکھوں کا آرزو مند رہا جس سے وہ پہچانا
جائے اور ویسے چاہنے والی بھی ہو۔ مَا نَظَرْتُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا وَرَاَیْتُ اللّٰہَ فِیْہِ تصورِ حُسن و عشق بس انھیں
دونوں سے عبارت ہے۔

حسن، پاکیزہ و صالح اقدارِ حیات کا نام بھی ہے۔ جس کے وجود سے جمالیاتی ذوق تسکین پاتا ہے۔
[illegible] عالمِ اجسام، سیّاراتِ سماوی ہوں کہ ذرّاتِ ارضی ہر ایک پر اسی کا پرتو ہے اور ہر شئے کا اسی
[illegible] میں ہے۔ حسن اشیا میں اپنے آپ نہیں اُس سارے ماحول میں ہے جہاں عشق موجود ہے اور
[illegible] سایہ فگن ہے اس نظر میں ہے جس میں یہ جلوہ گر ہے اس جذبے میں ہے جس میں یہ ظاہر ہوتا
ہے [illegible] کی وسعت عالمِ ارواح سے عالمِ مثال تک ہے۔ ساری کائنات میں "حقیقتِ جامع" ہی کا نام
حسن ہے۔ یہی "ذاتِ بحت" بھی ہے اور یہی سب میں جاری و ساری اور سب سے الگ بھی ہے۔ حسن
[illegible] پردہ میں بھی ہے جس کا نام جلال ہے اس مقام میں بھی ہے جہاں ابھی اس کا وجود ظاہر نہیں ہوا
اس کے جلال کا نام خلوت اور اس کے کمال کا نام جلوت ہے۔

عشق، قدسی صفت اور عالمِ اجسام میں تسلیم و رضا کا نام ہے۔ یہ اُن جلوؤں میں بھی ہے جہاں
حسن کی موجودگی کا صرف احساس ہی احساس ہے۔ اس کی وسعتیں عالمِ مثال سے عالمِ اجسام تک ہیں۔
حسن وحدت کا نام ہے عشق واحدیت کا۔ حُسن کی تہذیب التفات و رفاقت ہے تو عشق کی تہذیب
[illegible] ایک ظاہر ہے دوسرا مظہر۔ ایک جمال ہی جمال اور دوسرا جلال ہی جلال یہی خالقِ اکبر جل شانہٗ
کے دو ہاتھ ہیں جن سے اس نے آدم کے خمیر کو گوندھا۔ ابلیس کو ایک جگہ متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:
"مَا مَنَعَکَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ اَسْتَکْبَرْتَ اَمْ کُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ"

ترجمہ: جسے میں نے ہاتھوں سے بنایا اسے سجدہ کرنے سے کس بات نے تجھے روکا۔

کیا یہ تیرا تکبّر ہے یا تو عالین فرشتوں میں سے ہے۔

انسان کے شرف و بزرگی کے لیے بس یہی اور اتنی ہی بات کافی ہے۔ یہ وہ سندِ فضیلت ہے جسے خالق اکبر نے "مدعیِ شرف مخلوق کو بخشتے ہوئے عطا فرمائی اور ساری کائنات میں اس کا یہ امتیاز اور اس کا یہ فطری کمال ایسا وصف ہے کہ اس وصف میں کوئی دوسری مخلوق خواہ نوری ہو کہ ناری، آبی ہو کہ خاکی، اس کی شریک و سہیم نہیں۔ صحیفۂ آسمانی شاہد ہے کہ حق سبحانہٗ تعالےٰ نے جب عالم کن کے پہلے ہی دن تمام مخلوقاتِ ارضی و سماوی کی علمیت کا امتحان لینے کے لیے پہلے چند اشیا کے نام پوچھے اپنی ایک شئے جو "گنجِ مخفی" میں گراں قیمت تھی سب کے سامنے رکھ کر ترغیب فرمائی کہ جو اس شئے کو اپنے قلب میں بسائے گا اسے منصبِ نیابت و قرب سے سرفراز فرمایا جائے گا اور عظمت و بزرگی کا تاجِ زریں اس کے سر پر رکھا جائے گا۔ اس فرمانِ خداوندی کو سن کر سب نے گردن نیچی کر لی تکمیلِ حجت کے لیے نوری مخلوق کو پہلے دعوتِ عزیمت دی لیکن سرنگوں نگاہوں کو نظر اٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اس نے اپنی بے بضاعتی کا اعتراف کر کے عفو و درگزر کی درخواست کی۔ ناری مخلوق کی باری آئی تو اس کا چہرہ خوف و خشیت سے سیاہ ہو چکا تھا اور وہ اپنی اس حالت پر بجائے نادم ہونے کے حقارت سے آنے والے حالات کا جائزہ لینے لگی۔ آبی مخلوق منشاءِ ایزدی جانتے ہی اپنی نااہلی و عجز کا اظہار کر کے پانی پانی ہو گئی۔ تب خاکی مخلوق میں زمینوں، آسمانوں اور پہاڑوں کو اس بارِ امانت سے عہدہ برآ ہونے کا پیش کش کیا گیا لیکن شدتِ ہراس، قصور و ضعف نے انھیں ساکت و صامت کر دیا تو رب ذوالجلال نے اپنی شانِ کریمی سے اس مشتِ خاک پر توجہ فرمائی۔ اشارہ پاتے ہی

اس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی پیدا   وہ پاکیٔ فطرت سے ہوا محرمِ افلاک [له]

له ترمیم کے ساتھ اقبال کے شعر ان کی روح سے معذرت کے ساتھ نقل کیا گیا ۱۴۰

اور زیر کرنے سے سر پر اٹھا لیا۔ اس واقعہ کو قرآنِ حکیم نے یوں بیان کیا ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا [۲۲/۹]

یہاں اس آیتِ کریمہ کی یہ وضاحت نامناسب نہ ہوگی۔ اس آیتِ شریفہ میں دو لفظ "ظلوم و جہول" آئے ہیں جسے آدمِ خاکی کے لیے ایک خصوصی شرف و امتیاز ہی سمجھنا چاہیے اور حقیقت میں یہ ایسا ہی معاملہ ہے کہ انسان جو امانت دارِ سرِّ الٰہی ہو کر سرخرو ہوا تو دراصل اس کے مقام و منصب کی نشان دہی کے لیے انھیں الفاظ سے اُسے یاد رکھا گیا اور اس کا اعلان بھی اسی طرح فرمایا گیا۔ دراصل "ظلوم" سے عالمِ ارواح کی کیفیت اور "جہول" سے عالمِ اجسام کے تکلفات کی طرف بلیغ اشارہ ہے۔ یہاں اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ انسان دونوں عالموں کی نزاکتوں کا حامل ہے۔ شاہ ولی اللہ محدثِ دہلویؒ نے اس نکتے کو کچھ اس طرح واضح کرنے کی سعی فرمائی ہے:

> "ظلوم" کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی فطرت میں عدل کی صلاحیت تو موجود ہے مگر وہ عدل نہیں کرتا۔ "جہول" سے مراد ہے کہ وہ علم تو حاصل کر سکتا ہے مگر عملاً علم سے معریٰ رہتا ہے۔"[۱]

یہ امانت جسے صوفیائے کرام علیہم الرحمۃ نے "عشق" سے تعبیر کیا ہے۔ وہ شرف و بزرگی ہے جسے پا کر آدم مسجودِ ملائک ہوا اور اس کا قلب "عرشِ الٰہی" کا ہمسر۔ اسی کے باعث انسان مقامِ "اشرف الاشراف" پر فائز اور پھر بے انتہا انعاماتِ خداوندی کا مستحق ٹھہرا۔ انھیں انعاماتِ خداوندی میں فردوس مکینی و ہمہ نشینی اس شرط پر اُسے عطا ہوئے کہ وہ اس عطائے الٰہی کی عظمت پر حرف نہ آنے دیگا لیکن

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا   آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا[۲]

۱ لمعات ص۲۵

۲ اقبال ص۲

یہی وہ موڑ تھا جس سے گزر کر "عشق" صالح زندگی کے اس جامع مفہوم کو محیط ہوا جہاں خود "حسن" اس کی آرزوؤں و تمناؤں کی تکمیل کا وسیلہ و واسطہ ٹھہرا۔ پروفیسر نائٹ لکھتا ہے:

"حسن، فطرت کے مخفی قوانین کا ظہور ہے جو اس کے انکشاف کے نہ ہونے کے سبب ہم سے چھپا رہتا ہے۔" [1]

خالق اکبر سے کیے گئے عہد کے مطابق انسانِ اول نے منازلِ عبدیت کی تکمیل کے لیے اپنی معرفت کو اپنی ہی ذات میں گم کر کے ذوقِ جمالیات کی تسکین اس طرح کر لی کہ جو کچھ خالقِ اکبر جل شانہٗ نے اپنے لیے رکھ لیا تھا وہی سب کچھ انسان نے اپنے لیے بھی چن لیا۔ محبوب سے محبت، بدخواہ سے نفرت، رقیب سے رقابت، یہی سب کچھ باری تعالےٰ میں بھی ہیں اور انسان میں بھی مولانائے روم کا ایک شعر ہے:

خلق ما بر صورتِ خود کرد حق وصفِ ما از وصفِ او دیگر سبق

انھیں جذبات کو کمال تک پہنچانے اور کائنات کے فطری حسن کو آراستہ کرنے میں انسان خدائے بزرگ و برتر کا نائب ہے اور اسی کے باعث اسے "خلیفۃ اللہ فی الارض" کہا گیا ہے۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ [۱۴/۲۳]۔

انسان کی تخلیق کا مقصدِ ازلی شناختِ "حسن" ہے وہ اسی مقصد کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے فطری طور پر وہ اپنے ہم نفس کو چاہنے پر مجبور ہے اور اس کی شدید ترین صورت ہی "عشق" کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اسی کیفیت کی بدولت وہ اپنی خودی کی تعمیر و استحکام سے بڑے بڑے امور سرانجام دیتا ہے۔ عشق، وہ بنیادی اور اہم ترین حقیقت ہے کہ جس کے بغیر نہ تو حسن کا تصور ہی صحیح ہو سکتا ہے اور نہ اس کا کمال ہی درست ہے۔ افلاطون کا قول ہے:

[1] Philosophy of Beauty p. 61

"عشقِ کامل، حُسن کی جانب روح کی ایک حرکت کا نام ہے تاکہ
اس کو اس کی پاکیزہ ترین صورت میں دیکھے"۔ [1]

عشق کی شدید ترین آرزو فنا ہے۔ جبکہ حُسن آرزوئے بقا کے ساتھ ہر ممکن طریقے سے جذبۂ عشق کو ابھارتا ہے۔ عشق کی اسی ہمہ گیر قوت ہی نے نظام کائنات بنائے رکھا ہے: اقبال کا ایک شعر ہے:

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات　　عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

عشق، محبوب چیز کو حاصل کرنے کے دوران ہونے والے خاص تجربے کا نام بھی ہے جس سے گزر کر چاہنے والا خود کو بھی "محبوب چیز" تصور کر جاتا ہے۔ قاسم محمود نے لکھا ہے:

"یہ اس جمال (حسن) کی انتہائے آرزو ہے جس کو عالم موجودات
میں اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر تخلیق کرتے وقت ظاہر کیا"۔ [2]

غالب نے کہا ہے ؎

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں　　ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

حسن، خود عشق کا خالق ہے اور خالق کو اپنی ہر تخلیق عزیز ہوتی ہے، حسن کی انتہا عشق اور عشق کی انتہا تحیر و تسکین۔ کائنات کی ہر شئے محبت ہی کا تحفہ ہے اور ہر ایک دوسرے سے اسی محبت کے باعث اپنی ہیئت میں موجود ہے، جب اس میں کمی آنے لگتی ہے تو تغیر پذیر ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔

[1] مابعد الطبیعیات رومی ص ۳۵ خلیفہ عبدالحکیم ڈاکٹر
[2] انسائیکلوپیڈیا اسلامی ص ۱۰۲۶

تصورِ خیر و شر

قرآن حکیم کی ایک آیت ہے: "کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط سب اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ہے"

جب انسان کوئی فعل انجام دینا چاہتا ہے یا انسان کسی کام کے انجام دینے کا ارادہ کرتا ہے یا از خود انسان سے بلا ارادہ کوئی فعل سرزد ہو جاتا ہے تو ایسا ہر فعل وقوع ہونے سے قبل ہی اللہ تعالیٰ سے اجازت کا طلبگار ہوتا ہے۔ منشائے الٰہی کے مطابق ہر فعل کو اذنِ الٰہی تو مل ہی جاتا ہے لیکن اگر یہ فعل اللہ کی رضا سے ہو تو شر اور اس کی رضا کے عین مطابق ہو تو خیر کا نام پاتا ہے۔ حضرت مولانا عبدالقدیر صدیقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"نظامِ کُلی، مصلحتِ عامہ کے لحاظ سے ہر شئے موجود ہے اپنے
مقام پر اچھی ہے۔ تحقیق سے ثابت ہو گیا ہے کہ مرجعِ خیر وجود ہے
اور مرجعِ شر عدم ہے۔ اعتبارِ خیرِ محض واجب الاعتقاد ہے اور اسی
پر تصوف کی بنیاد ہے۔" [1]

انسان چونکہ اپنی سرشت میں دو متضاد فطرتوں کا مجموعہ اور اپنی ہیئتِ ترکیبی میں جسم و روح کا مرکب ہے[2] جہاں کثیر تر نعمتوں سے جسم تو عظیم تر برکتوں سے روح مزین نظر آتی ہے۔ انسان کو (اپنے ہونے میں) خیرِ محض بھی کہا گیا ہے۔ کیوں کہ ہر شئے موجود خیر ہی خیر ہے، شر بذاتِ خود کسی وجود کا نام نہیں ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی کو قتل کر دیتا ہے۔ اس شخص کا فعل مقتول کی برادری اور اس کے عزیزوں کی نظر میں "شر" ہے لیکن خود قاتل اور اس کے طرفداروں ہی کی نظر میں تو یہ خیر ہی خیر ہے۔ خیر ظاہر ہوتا ہے تبھی شر معلوم ہوتا ہے۔ پہلے سے شر ظاہر و موجود نہیں ہوتا اسی لیے صوفیائے کرام نے اسے عدم کہا ہے۔ ان کا یہ قول ہے "الوجود

[1] العرفان ص ۱۶۹

[2] اگر ہو ذوق [illegible] تو کھول کر دیکھ / وجودِ حضرتِ انساں نہ روح ہے نہ بدن (اقبال)

"خیرِ محض والعدم شرِ محض"، حضرت جامی علیہ الرحمہ کا ایک قطعہ ہے:

ہر جا کہ وجود کردہ سیر است اے دل ۔۔۔ می داں بہ یقیں کہ محض خیر است اے دل
ہر شر ز عدم بود، عدم غیرِ وجود ۔۔۔ پس شر ہمہ مقتضائے غیر است اے دل

تمام کائنات و دنیائے اسباب میں کوئی فعل و عمل، کوئی شئے، کوئی وجود ایسا ہے ہی نہیں جس پر "محض شر" ہونے کا حکم لگایا جاسکے۔ ہر شئے موجود کو اس کی فطرت کے عین مطابق، عمل کا موقع فراہم کرنا ہی "خیر" ہے خواہ وہ کسی کے لیے خیر بنتا ہو یا شر ہوتا ہو۔ علامہ عبدالقدیر صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے۔

"جہاں خوبی پاتے ہو، وہ وجود کی وجہ سے ہے، جہاں شر سمجھتے ہو اس کا مرجع "عدم" ہی ہے۔ سپاہی کے دست نے وار کیا تلوار نے برش دکھائی۔ گردن کٹ گئی، دشمن کا سر اُڑ گیا، غور کرو یہاں شر کہاں سے پیدا ہوا؟ اگر سپاہی کا ہاتھ خالی جاتا یا وہ کمزور ثابت ہوتا تو عیب تھا۔ تلوار کی تیزی بھی قابلِ تعریف ہے۔ مقتول کی گردن کا کٹنا بھی اس کی طبیعت کا مقتضی تھا۔ شریت جو پیدا ہوئی وہ زوالِ حیات سے۔ مقتول کی بیوی کا بیوہ ہونا، بچوں کا یتیم ہو جانا اس کے متعلقین کا کوئی خبرگیر نہ ہونا باعثِ شر ہیں جو سب عدمی ہیں"[1]

انسان جب مسجودِ ملائک ہوا اور تمام مخلوقات میں اس کی توقیر بڑھی تو اس کا عنصرِ خاکی اس کی ذات سے بزرگ نہ تھا بلکہ کیفیتِ "نفخت روح" اسے برگزیدۂ عالم بنا گئی تھی اور فی الحقیقت یہی پھونکی ہوئی روح ہی مسجودِ ملائک تھی اسی کو "نور" اور "ملک الحق"[2] بھی کہا گیا۔ یہ جسدِ خاکی اسی "ملک الحق" [illegible] ہے مولانائے روم فرماتے ہیں ؎

[1] المعارف حصہ دوم ص ۴۹
[2] افحسبتم انما خلقناکم عبثا وانکم الینا لا ترجعون فتعالی اللہ الملک الحق [illegible] المبین

آدمی چوں نور گیرد از خدا ہست مسجودِ ملائک مُجتبا

اس شرف و بزرگی کے بعد انسان کو جس بڑی فضیلت سے سرفراز فرمایا گیا وہ عقل و دانش علم و فہم کی فضیلت تھی۔ اس عالمِ اسباب و علل کی حقیقت کو اس وقت تک سمجھا ہی نہیں جا سکتا، جب تک خیر و شر، نیکی و بدی، برائی و بھلائی، غلط و صحیح کی حقیقت واضح نہیں ہو جاتی۔ خیر و شر کا معاملہ انسان کا اپنا انفرادی معاملہ ہے، یہ انفرادی معاملہ عقل کی کسوٹی پر اگر کھرا اترتا ہے تو اسے "خیر" اور اگر اس کے برخلاف ہوتو اسے "شر" سے تعبیر کیا جائیگا۔ عقل، جو انسان کو برے بھلے کی تمیز، خیر و شر سے واقف کراتی ہے سب سے بڑا شرف ہے جو انسان کو ساری مخلوق میں اللہ تبارک و تعالےٰ کی طرف سے عطا ہوا۔ چونکہ انسان کو روحانی و جسمانی دونوں ہی لذایذ و خواہشات کا مجموعہ بنا کر دنیا میں بھیجا گیا ہے اس لیے انہیں توازن و اعتدال برقرار رکھنے کے لیے اسے فکر و دانش سے نوازا گیا۔ اگر یہ توازن بگڑ گیا تو از خود شر کی سمتیں نکل آتی ہیں اسی توازن کے بگڑ جانے کو عقلِ ناقص سے تعبیر کیا گیا جہاں اس کے دامن میں شر کو پنپنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اسی لیے صوفیاے کرام نے تزکیہ نفس کو شناختِ رب کا لازمہ قرار دیا۔ جس کی بدولت سالک سوزِ صدیقی، جلالِ فاروقی، حمیتِ عثمانی و کردارِ حیدری کا آئینہ بن جاتا ہے۔

تصورِ خیر و شر صوفیائے کرام علیہم الرحمہ کے نزدیک تمام تصوراتِ تصوف میں اہم ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تصوف کی جتنی بھی اصطلاحیں ہیں۔ یہ سب کسی نہ کسی حیثیت سے وحدت الوجود کے تصور سے مربوط و منسلک ہیں اور ہر اصطلاح اپنی جگہ اک مکمل علم اور مہتم بالشان علم کا باب ہے۔

نظریۂ تصور و تصدیق

صوفیائے کرام کے نزدیک تزکیۂ نفس و تجلیۂ روح و قلب کے بعد سب سے اہم ترین منزل "تصور و تصدیق" کی ہے تفکر دوام و محاضرۂ قلب کے وقت، مکاشفات و مشاہدات کے دوران پیش آنے والے واقعات اور خیالات کی تصحیح اسی سے کی جاتی ہے تصور کا قائم ہوجانا آسان بلکہ عمومی ہے جبکہ مشاہدہ والی ہیئت کی تعبیر آسان نہیں۔ اگر یہ غلط ہوجائے تو ایمان خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ جیسے حضور آقائے دوجہاں ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کو کبھی اعرابی تو کبھی حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں ملاحظہ فرمایا تو اس سے آپ نے جبرئیل علیہ السلام کو مجسم نہیں جانا یا دودھ کو دیکھ کر اس پر "علم" کا حکم نہیں لگایا اور نہ آپ نے اپنی امت سے یہ کہا کہ دودھ علم کی ایک شکل کا نام ہے جیسا کہ بعض اقوام عالم کے اہل مکاشفہ نے "علم" کو بعض خاص قسم کے اجسام میں دیکھا۔ جیسے ہندوستان میں "سرسوتی" علم کی ایک علامت ہے، ممکن ہے اہل ہند کے کسی رشی نے علم کو سرسوتی کے روپ میں دیکھا ہوگا اور اس جیسا مجسمہ بنا کر طالب علموں کو دکھایا ہوگا۔ مجاز، مجاز ہی ہے اور حقیقت، حقیقت؛ مجاز کبھی بھی حقیقت کی جگہ نہیں لے سکتا۔ لیکن " ہر مجاز کی ایک حقیقت ہے، حقیقت کی طرف توجہ کرنا ہی حق ہے "[۱]

تصور و تصدیق میں حقیقت ہی کی طرف توجہ کی جاتی ہے تاکہ باطنی حیرت حاضر ہوجائے حقیقتاً "تصدیق" اک علم ہے اس کے دائرے میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کے صحیح یا غلط ہونے کی تفہیم کا نام "تصدیق" ہے۔ مثلاً ناریل کے پانی کو صرف دیکھ کر یہ حکم لگانا کہ یہ پانی ہے "تصور" کہلاتا ہے اسے چکھ کر مزہ کی دریافت پر اسے ناریل کا پانی سمجھنا "تصدیق" ہے۔ اصطلاحاً کسی دیکھی ہوئی شئے کو اس کی عدم موجودگی میں باطنی آنکھوں سے دیکھنا "تصور" ہے اور اس کی مثل شبیہ

[۱] علامہ عبدالقدیر صدیقیؒ، العرفان صفحہ ۲۷

پیدا کرنے والی غیر حقیقی شے کے تصور کی تصحیح کر کے اُسے اس کی حقیقت میں ثابت کرنا تصدیق ہے تصور جب آسان ہو، حساس اور کامل الیقین کہ شعور اس کا فوری ثبوت فراہم کر دے تو یہ تصدیق، تصور کے تابع ہوگی اور جب اس کے برعکس ہو تو یہ تصور اپنے ہونے میں تصدیق کے تابع ہوگا۔ قدرِ اول کی تعریف کی مثال، پانی کا تصور قائم کرنا اور ہر طرف پانی ہی پانی دیکھنا یا آگ کا تصور کرنا اور آگ ہی آگ ملتہب محسوس کرنا۔ قدرِ ثانی کی مثال حقیقتاً پانی کو موجود دیکھنا اور اسے غیر فاعل دبے صفت جان کر اس پر سے گزر جانا اسی طرح حقیقتاً آگ کو روشن شعلہ زن دیکھنا اور اس کو بے اثر جان کر اس میں سے نکل جانا۔

جو شے کہ دیکھی ہوئی نہ ہو لیکن اس کا تصور کوئی شکل تخلیق کر کے دکھا دے اور ادراک اس کی تصدیق کر دے تو اسے **مکاشفہ** کہا جاتا ہے۔ اگر یہ مشاہدہ حق میں ہو تو اسے "حیرت باطن" کا نام دیا جاتا ہے۔ شعور کے مثبت فعل کا نام تصور ہے اور ذہن کے مثبت عمل کا نام تصدیق ہے قاسم محمود لکھتے ہیں:

"کسی شے کی ماہیت کا ادراک، بغیر اس کے کہ اس ماہیت پر حکم لگایا جائے "تصور" ہے۔ نیز تصوری علم کا ذریعہ حد یا تعریف ہے اور جب دو یا دو سے زیادہ تصورات پر انھیں موضوع اور محمول کی حیثیت سے طرفین قرار دے کر نفی یا اثبات کا حکم لگایا جائے تو اسے "تصدیق" کہتے ہیں"۔[۱]

جواہرِ اسرار اللہ کی ساری نظمیں، تصور و تصدیق کا گنجینہ معلوم ہوتی ہیں۔ حضرت قدس سرہٗ العزیز نے ہر تصور کو عقدہ کا نام دیا ہے اور اس کی تصدیق کو مکاشفہ سے ظاہر کیا ہے۔

[۱] اسلامی انسائیکلوپیڈیا ص ۵۰۲

کچھ موجودہ متن کے بارے میں

مجھے دستیاب تمام نسخوں میں صرف تین ہی نسخے ایسے ہیں جنھیں مکمل کہا جا سکتا ہے۔ انہیں ایک کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد کا نسخہ ہے۔ جو خطِ نسخ کا بہترین نمونہ ہے۔ دوسرا کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد کا مخزونہ ہے۔ غالباً یہ پہلا واحد نسخہ ہوگا جو خطِ نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ لیکن قدیم املا ہونے کی وجہ سے اسے قرأت کرنا آسان نہیں ہے۔ تیسرا مکمل نسخہ حضرت سجادہ صاحب روضہ گاؤں دھمنی کا مملوکہ ہے۔ اس میں درمیان کا ایک صفحہ غائب ہے لیکن میں نے سالار جنگ کے نسخے کی مدد سے اسے مرتب کر لیا ہے۔ اس کی قرأت نسبتاً آسان ہے اگرچہ کرم خوردہ و لفظ میں لفظ ملا کر لکھنے کی وجہ سے تھوڑا سا تکلف ہوتا ہے لیکن اسے پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسرے اور نسخے جنھیں سالار جنگ کے دو[2]، آصفیہ کا ایک[1] اور کتب خانہ پیر محمد شاہ گجرات کے دو[2] نسخے ہیں جو ناقص الاول و آخر ہیں۔

میں نے موجودہ املے کے مطابق بعض الفاظ کو درست کر کے کتابت کی ہے جس سے اس کا پڑھنا آسان ہو گیا ہے۔ مثلاً کاتبوں نے "گ" کے اظہار کے لیے "ک" پر تین نقطے لگائے ہیں [ڭ] میں نے "گ" لکھا ہے اسی طرح "د" پر "ڎ" چار نقطے اس بات کی علامت تھے کہ یہ ہندی کا "ڈ" ہے اسی طرح "ڑ" وغیرہ کی بھی میں نے موجودہ املا کے مطابق کتابت کی ہے۔

گجراتی میں ایک لفظ "ماں" عام طور حرفِ ربط ہے جس کے معنی اُردو میں "میں" کے ہیں۔ اسے تمام نسخوں کے کاتبوں نے "منہ" لکھا ہے۔ چونکہ کلام میں کسی جگہ "منہ" کا لفظ چہرے کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے اس لیے اس نسخے میں جہاں جہاں یہ لکھا گیا ہے وہاں گجراتی تلفظ میں "ماں" لکھا ہے۔ گجراتی زبان میں یہ لفظ آج بھی اسی طرح لکھا اور بولا جاتا ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اسے "منہ" لکھا جائے۔